لسلۂ مطبوعات الٰہ آباد لٹریری و کلچرل ایسوسی ایشن، الٰہ آباد

مُصنّفہ

شفیق جونپوری

ادارہ "انیس اردو" ——— الٰہ آباد

دور حاضر میں نشر و اشاعت کی دشواریوں میں جس قدر اضافہ ہوا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن نامناسب حالات کے باوجود ادارہ "انیس اُردو" الہ آباد نے آنے والی نسلوں کے ادبی اور علمی شعور کو مد نظر رکھتے ہوئے پورے بھروسے کے ساتھ تالیف و تصنیف اور اعلیٰ معیاری اور تعمیری ادب کی نشر و اشاعت کی اہم ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے اور ہمیں امید ہے کہ انشاءاللہ ہماری کوششیں کامیاب ہوں گی۔

ہمیں یقین ہے کہ جس حُسن نیت سے اس ادارہ نے اس سلسلہ کا آغاز کیا ہے اسی وسعت قلب سے ہماری ہمت افزائی بھی کی جائے گی۔

سکریٹری نشر و اشاعت

ادارہ "انیس اردو"

الہ آباد
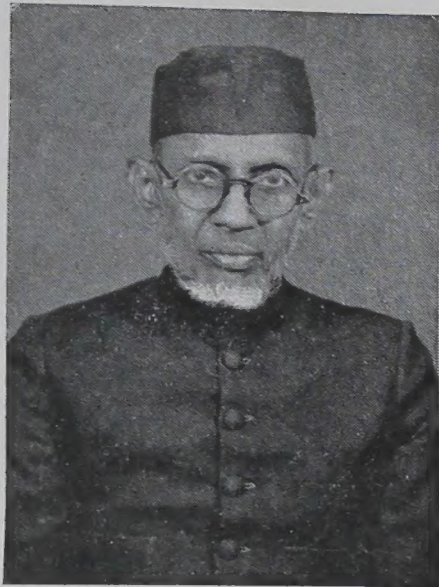
"Shafiq" Jaunpuri
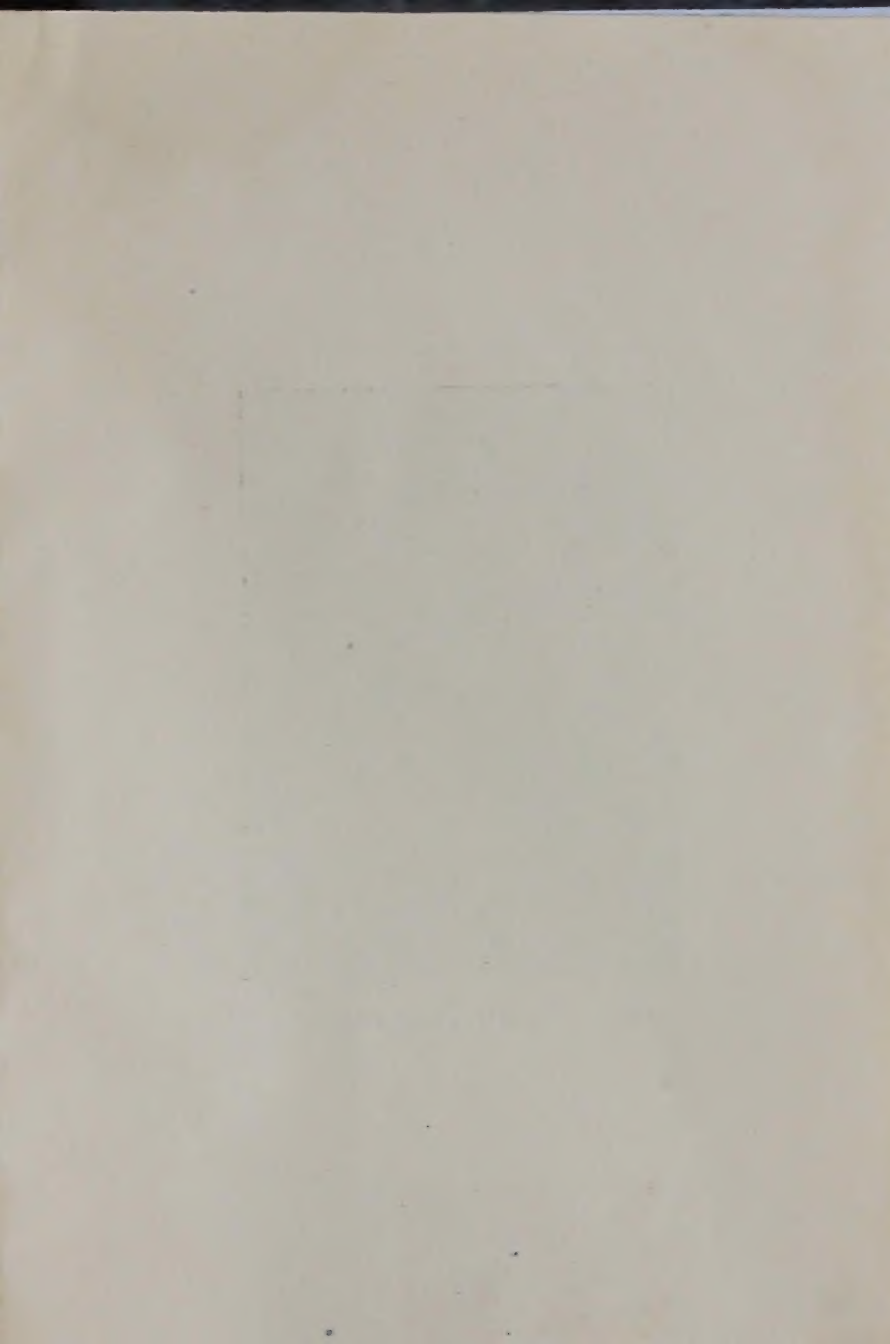
جواہر لال نہرو

جواہر لال نے سمجھا ہے رازِ حکمرانی کو
سیاست آفریں کہتی ہے ان کی نکتہ دانی کو
شفیق ان کو دعا دیتا ہے ہندو بھی مسلمان بھی
کہ ان کی ذات پر ہے فخر ہر ہندوستانی کو

انتساب

میں اس مجموعہ کو اصد خلوص و عقیدت
زعیم ایشیا پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند
کے نام معنون کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں

شفیق جونپوری

فہرست

غزلیات

مضامین | صفحہ

مضامین	صفحہ

مضامین	صفحہ

صفحہ

مضامین

مضامین	صفحہ

پرنٹر عبدالمجید اسرار کریمی پریس الہ آباد - فون نمبر ۵۰۳

تعارف

فخر مشرق علامہ شفیق جونپوری شیراز ہند جونپور کے ایک ممتاز علمی و ادبی اور مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش ۲۹ صفر ۱۳۲۱ھ مطابق ۶ مارچ ۱۹۰۲ء یوم چہار شنبہ بوقت آخر شب ہے۔ نام ولی الدین تخلص شفیق ہے۔ ممتاز عالم و شاعر حضرت حافظ الحاج مولانا محمد یعقوب انیق صدیقی علیہ الرحمہ شاگرد داغ دہلوی کے فرزند اکبر ہیں۔ والدہ محترمہ امام العلماء حضرت الحافظ الحاج غوث الوقت مولانا سید امام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی پوتی اور سید الحفاظ مولانا سید محمد صدیق علیہ الرحمہ بانی مدرسہ صدیقیہ قرآنیہ جامع مسجد شرقی کی عبادت گذار صاحبزادی تھیں۔

شفیق صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنی خالۂ محترمہ واحدہ خاتون مرحومہ کے زیر نگرانی حاصل کی مرحومہ خود بھی ایک تعلیمیافتہ اور صاحب قلم خاتون تھیں۔ شعر و شاعری اور مضمون نگاری کا اچھا ذوق رکھتی تھیں مرحومہ کی توجہ کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ شفیق صاحب ۹ برس کی عمر سے شعر کہنے لگے ان میں ادبی رسائل و اخبارات کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا مگر جد امجد مولانا حافظ سید محمد صدیق رح اور والد ماجد مولانا حافظ محمد یعقوب انیق کو شفیق صاحب کی یہ دلچسپیاں پسند نہ آئیں اور ان کی فطرت پر شدید ظلم کیا گیا۔ خاندان کے بزرگوں کی خواہش تھی کہ شفیق صاحب کو صرف دینی تعلیم اور حفظ قرآن پاک میں مشغول رکھا جائے۔

چنانچہ ۱۸ سال کی عمر تک شفیق صاحب نے اپنے بزرگوں کی عائد کردہ پابندیوں کا لحاظ کیا۔ انھیں پابندیوں نے ان کو حافظ قرآن بنا دیا اور دینی تعلیم کی پہلی منزل بھی طے کرا دی۔ دوسری منزل کے ساتھ جوانی کا آغاز شعر گوئی کے لئے پیام نو لایا اور اب اپنے شوق کی راہ میں بزرگوں کی مزاحمت اور گھر کی پابندیوں سے آزاد ہو کر وہ عربی و فارسی کی تعلیم اور اپنے ادبی ذوق کی نشو و نما کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے بنارس، غازی پور، الہ آباد، لکھنؤ شاہجہانپور، علی گڈھ، اور اجمیر شریف کی علمی درسگاہوں میں عربی و فارسی کی تعلیم اور درس نظامیہ کی تکمیل کی۔ تحصیل علم کے شوق میں وہ بالکل غیر متعصب تھے جہاں سے بھی علم کی روشنی ملے وہ مستفید ہونے کے لئے تیار رہتے۔ یہ شوق اس قدر غالب تھا کہ شادی کے بعد بھی عرصۂ دراز تک سلسلۂ تحصیل علم جاری رہا۔

شفیقؔ صاحب کو فراغت کی زندگی کبھی بھی نصیب نہ ہوئی لیکن چالیس سال کی عمر تک تو وہ تیس روپیہ ماہوار بھی آمدنی نہ رکھتے تھے کبھی عربی مدارس میں کبھی کسی اخبار کے دفتر میں معمولی تنخواہوں پر کام کرتے رہے اطمینان کے ساتھ انھیں فکر سخن کا موقع نہ مل سکا۔ تاہم چالیس سال کی مشق سخن اور مشاعروں کی شرکت کی وجہ سے اب ان کی شہرت کا زمانہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ مشاعروں میں مقبول ہونے لگے۔ اقتصادی حالت بھی سدھرنے لگی رفتہ رفتہ شفیق صاحب کی شہرت نے ان کے تعلقات کو وسیع بنایا۔ ہر قسم اور ہر طبقے کے لوگوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ ارباب دانش و کمال نے یہ کہا۔ مولانا عبد السلام ندوی نے ان کی پاکیزہ اخلاقی زندگی کی تعریف کی حضرت جگر مرادآبادی نے بلند انسانوں کی صف میں جگہ دی، علامہ اقبال احمد سہیل نے صاحب بصیرت ہونے کا اعتراف فرماتے ہوئے لکھنؤ اور اعظم گڈھ کے کل ہند مشاعروں میں "فخر مشرق" کا خطاب دیا۔ مولانا عبد الماجد دریابادی نے ذہنی بلندی کی داد دی علامہ نیاز فتحپوری نے طہارتِ فکر اعتدال جذبات زبان و محاورہ و لغت و تراکیب اور آداب فن کا پاسبان قرار دیا۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے صاحب طرز شاعر تسلیم کیا۔ نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ادبی محاسن اور طرز خاص کا موجد قرار دیا۔ مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر بی۔ سی۔ رسن نے قومی شاعر کہا۔ راجستھان کے گورنر ڈاکٹر سمپورنا نند نے ممتاز شاعر و ادیب کا درجہ دیا۔ اور ہمارے محبوب وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے اس اعزاز و احترام سے نوازا جس کا شرف اس دور کے کم شعرا کو حاصل ہوگا۔

شفیق صاحب عزت و شہرت پیدا کرنے کے موجودہ طریقوں سے قطعاً ناواقف تھے۔ پریشاں حالی کی زندگی گذارنے کے باوجود اکثر ایسے مواقع آئے جب وہ شہرت اور دولت بآسانی حاصل کر سکتے تھے۔ مگر ان کے خلوص ان کی خودداری و بے باکی اور ان کی فطری شرافت و صداقت نے سستی شہرت و دولت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۹۴۷ء سے قبل کا زمانہ جیسا پر آشوب گذرا ہے اس کی یاد ابھی دلوں سے محو نہ ہوئی ہوگی مسلم لیگ اپنے مقاصد کے لئے ہر قسم کی جد و جہد میں مصروف تھی روپیوں کے ذریعہ بھی لوگوں کو ہموار کیا جا رہا تھا اسی دور میں شفیقؔ جونپوری کو پانچ سو روپیہ ماہوار پر لیگ کا ہم خیال بنانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن مولانا شفیقؔ نے صاف انکار کر دیا اور اپنے بھائی الحاج مولانا ظفر الحسن ظفرؔ صدیقی سے اس پیش کش کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس اور لیگ کا یہ ہنگامی دور ہے بد قسمتی سے ملک تقسیم بھی ہو جاتا ہے تو مجھے رہنا ہندوستان ہی میں ہے۔ اور جب کسی قیمت پر ہندوستان نہیں چھوڑ سکتا تو لیگ کی موافقت بھی نہیں کر سکتا نہ اسے مسلمانوں کے لئے مناسب سمجھتا ہوں۔ علاوہ ازیں میں اپنی شاعرانہ حیثیت کو آزاد رکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ وہ اس محبت وطنی پر زندگی کے آخری لمحات تک قائم رہے بقول مولانا ماہر القادری "وہ اپنے وطن سے اپنے محبوب کی طرح محبت کرتے تھے"۔ جس کا اظہار جا بجا ان کی نظموں "ہمارا دیش"، "حب وطن" اور "پاکستان کا

خط" میں ملتا ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد جب شفیقؔ صاحب صف اول کے مسلم الثبوت شاعر تسلیم کئے جا چکے تھے پاکستان کی مقتدر شخصیتوں نے عہدہ و منصب کی پیش کش کی اور پاکستان آنے کی درخواست کی۔ شفیقؔ صاحب نے اس درخواست کو نامنظور فرماتے ہوئے اپنی مشہور نظم "پاکستان کا خط" تخلیق کی جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

بلا رہی ہو کراچی میں تم ہمیں لیکن — وہاں وطن کا نظارہ کہاں سے لائیں گے
بجا کہ ساحل راوی ہے پُر بہار مگر — یہ گومتی کا کنارا کہاں سے لائیں گے
کہاں ملے گا بنارس کی صبح کا منظر — اودھ کی شام دل آرا کہاں سے لائیں گے
ہم اہل ہند کے درد آشنا "جواہر لال" — تری نظر کا سہارا کہاں سے لائیں گے
ہوا کہ مرکز اُردو کراچی و لاہور — شفیقؔ سا سخن آرا کہاں سے لائیں گے

شفیقؔ صاحب ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جہاں مذہبیت تصوف اور روحانیت کا دور دورہ تھا۔ مغربیت سے نفرت، سائنٹیفک تبدیلیوں سے بے توجہی اور ترقی پسند رجحانات کی کمی تھی۔ شفیقؔ صاحب نے اسی ماحول میں نشو و نما پائی، عسرت و بے اطمینانی نے کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور نہ وہ کوئی ایسا حلقہ اور ذریعہ رکھتے تھے جو ان کی شخصیت کو بنانے اور نکھارنے میں ان کا معاون ہوتا، بایں ہمہ انھوں نے جو اعلیٰ عزت و شہرت حاصل کی ارباب علم و ادب اور جمہور نے جس قدر منزلت سے نوازا اس پر حیرت ہوتی ہے۔ مولانا ماہر القادری مدیر فاران کراچی نے صحیح لکھا ہے کہ شفیقؔ جونپوری کو پروپگنڈہ کی فن تو ہوا بھی نہ لگی تھی۔ اس دنیا میں مشہور ہونے کے کیا طریقے اور تدبیریں ہیں اسے وہ جانتے ہی نہ تھے شعر و ادب کی دنیا میں ان کا تعارف، خود ان کا کلام، ان کی شہرت کسی پروپگنڈے کی رہین منت نہیں۔ وہ اپنے کلام کی خوبیوں کے لئے مشہور ہیں۔ جس نے ان کا کلام ایک بار پڑھ لیا اس کے دل میں شفیقؔ کے لئے جگہ

پیدا ہوگئی ہے۔

حضرت شفیق کا نام اور کلام ان شاعروں کے تذکروں میں آنا چاہیئے جو حقیقی شاعر ہیں اور جن کے کلام نے اردو شاعری کی آبرو بڑھائی ہے۔"

حضرت شفیق کی زندگی میں شاعرانہ جولانی ادبی امنگ علمی انہماک ہیں سے بہتر زمانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنہ ۱۹۴۱ء سے سنہ ۱۹۴۹ء تک رہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی مشہور نظمیں مقبول اشعار استادانہ قصائد معیاری تصانیف زیادہ تر اسی دور کی ہیں کاروان ترقی بڑی تیزی سے رواں دواں تھا۔ کہ سنہ ۴۹ء میں اکلوتے فرزند صلاح الدین صدیقی داغ، فراق دے گئے۔ اس حادثہ کے بعد رفتار ترقی سست ہوگئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ شعر کہتے رہے دل کا ولولہ تو مرہی چکا تھا۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۱ر جنوری سنہ ۱۹۵۶ء کو جونپور میں ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر یوم شفیق منایا گیا۔ اس کل ہند ادبی اجتماع میں ارباب فکر و نظر نے جس شان سے شفیق صاحب کی شخصیت کو خراج تحسین پیش کیا وہ اردو و ادب کی تاریخ میں ایک زرین مثال ہے۔ جبکہ بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی کسی شاعر کو اس کی زندگی ہی میں اعزاز و احترام سے نوازا گیا ہو[1] اسی سال شفیق صاحب کیلئے مرکزی و صوبائی حکومتوں نے وظائف جاری کئے۔ مگر ان کی صحت روز بروز گرتی گئی اور آفتاب علم و ادب جو مارچ سنہ ۱۹۰۲ء کی ایک صبح کو نمودار ہوا تھا وہ ۵ر مارچ سنہ ۱۹۶۳ء کی شام کو ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

سفر دراز ہے اور آفتاب ڈوب چلا
شفیق تیز بڑھاؤ قدم کہ دن کم ہے

---

[1] یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اس سے بھی پہلے اردو والے علامہ اقبال اور امجد حیدرآبادی وغیرہ کو ان کی زندگی میں خراج عقیدت پیش کر چکے ہیں۔

(ادارہ)

شفیق صاحب کا پاک سینہ الہام و آگاہی سے معمور تھا۔ اس "مرد مومن" نے انتقال سے سال دو سال پہلے اپنے ایک قدرداں جناب قیسی الفاروقی ڈویژنل مجسٹریٹ جونپور سے فرمایا" اچھا ہوا آپ یہاں آگئے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی موجودگی ہی میں میرا خاتمہ ہو جائے۔ اور آپ اپنے ہاتھوں سے مجھے آخری منزل تک پہنچا دیں۔"

مولانا سید فصیح الاحسن لکچرر محمد حسن کالج جونپور سے کئی سال قبل فرمایا تھا "میری نماز جنازہ آپ ہی پڑھائیں گے"۔ خداوند عالم کو منظور بھی یہی تھا سید صاحب موصوف نے نماز جنازہ پڑھائی اور فاروقی صاحب نے ہزاروں سوگواروں کے ساتھ آخری منزل تک پہنچایا۔

شفیق صاحب کا انتقال ۵ بجے شام کے وقت ہوا، آیات ودرود کا ورد فرماتے ہوئے، اچانک اپنا سر رفیقہ حیات کے زانو پر رکھ دیا اور روح اس طرح پرواز کر گئی جیسے نسیم چمن کی خوش خرامی سے کوئی پھول اپنی شاخ سے جدا ہو جائے دوسرے روز دوپہر کے بعد تدفین عمل میں آئی اب اس پس منظر میں مرحوم کے درج ذیل اشعار کی داد دیجئے۔ جو الہامی کیفیت کے حامل ہیں۔ اور جو بعد مرگ واقعات کی شکل میں ظہور پذیر ہوئے ؎

شفیق اپنی تمنا ہے کہ سر ہو ان کے زانو پر رکی ہو جس گھڑی آنکھوں میں جان ناتواں میری

شبنم ہے اشکبار سیہ پوش ہے فضا مرگ شفیق بے سروساماں کی رات ہے

بوقت شام پہونچے قافلے والے دوراہے پر کہاں ڈوبا ہے سورج جب مقام امتیاز آیا

نہیں معلوم یہ شہر خموشاں کیسی بستی ہے زمیں آباد ہو جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

صبا پہچان یہ ہوگی مری مرگِ اسیری کی | کہ گلشن میں یکایک جل اُٹھے گا آشیاں میرا
دمِ آخر وہ خود بالیں پہ ان کا بے نقاب آنا | شفیقؔ جاں بلب کو آخری دیدار ہو جانا
کی مرگِ عشق نے ابدی زندگی عطا | دنیا میں ہر زبان پہ مری داستاں ہے اب

شفیقؔ صاحب صرف شاعر ہی نہ تھے، مقرر، خطیب، نقاد، ادیب، مصنف مؤرخ .... شعروادب کی فنی معلومات سے باخبر اور متعدد کمالات کے حامل تھے۔ حمد و نعت اسلام و مناقب خصوصاً قصیدہ گوئی اور فنِ تاریخ گوئی پہ کامل عبور رکھتے تھے اردو شاعری کی مذکورہ اصناف میں وہ دورِ حاضر کے شعراء میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ شفیقؔ صاحب کی اس جامعیت و قادر الکلامی کا ارباب علم و نقد نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

شفیقؔ صاحب کو نظم و غزل پر یکساں قدرت حاصل تھی مگر جو جوہر سب سے زیادہ نمایاں اور مقبول ہو کر ہر خاص و عام سے دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے وہ ان کی غزل گوئی ہے، ایک صاحب طرز اور منفرد غزل گو کی حیثیت سے اردو کے صف اول کے شعراء میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔

ابتداء میں شفیقؔ صاحب نے جناب حفیظ جونپوری اور حضرت نوح ناروی سے اصلاح لی۔ تحریک خلافت میں مولانا حسرتؔ موہانی علیہ الرحمہ کے شاگرد ہو گئے ۱۹۴۱ء میں مولانا نے بلا اصلاح غزلیں پڑھنے کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا کہ "اب تم کو اصلاح کی ضرورت نہیں ہے"

شفیقؔ صاحب کے کلام میں ان کے والد مولانا انیقؔ شاگرد داغؔ دہلوی مولانا

حسرت موہانی، حفیظ جونپوری، علامہ اقبال اور مولانا حالی کا رنگ سخن بھی ملتا ہے مگر اس طرح کہ شفیق نے سب سے جداگانہ اپنا مخصوص رنگ اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔

ارباب علم و نقد شفیق کو حسرت موہانی کا جانشین تسلیم کرتے ہیں اردو کے مشہور ادیب حرمت الاکرام نے لکھا ہے کہ "جس طرح حسرت کی شاعری میں ارضی محبت کی دھوپ چھاؤں کی لطافتیں اور نزاکتیں ہیں اسی طرح شفیق کی شاعری پر اسی فردوس آب و گل کی کسی حور کے جمال بے مثال نر دز کا پرتو ہے۔ لیکن حسرت کی شاعری میں نشاط و سرمستی کا پہلو جس قدر غالب ہے شفیق کی شاعری میں اس کی اتنی ہی کمی ہے اور اس کی جگہ حزن و غم کی کیفیت غالب ہے گی۔ حسرت صرف تخلص کے حسرت ہیں لیکن شفیق حسرت مجسم ہیں۔ حسرت محبوب کی قربت پر غزل خواں ہوتے ہیں اور یہ قربت ان کی غزلوں کو کیف و سرور کا سرمایہ عطا کرتی ہے۔ لیکن شفیق کا دل محبوب کی قربت کے باوجود اس ترٹپ سے خالی نہیں ہو پاتا جو ان کی رگ رگ میں رچی ہوئی ہے۔"

اوپر جو کچھ لکھ آیا ہوں اس کا مقصد محض شفیق صاحب کے کچھ ذاتی حالات . . . . پیش کرنا ہے۔ رہا ان کے ادبی مقام کو متعین کرنا سو میں اس کو اردو شاعری کے ناقدوں کے لئے چھوڑ دیتا ہوں۔

حضرت شفیق جونپوری کی تقریباً نصف صد تصانیف شائع ہو چکی ہیں مگر کتابت طباعت اور ترتیب کے لحاظ سے چند کتابوں کے سوا ان کا کوئی مجموعہ کلام دیدہ زیب اور معیاری طباعت کے ساتھ سامنے نہیں آیا۔

ادارہ انیس اردو الہ آباد لائق صد مبارکباد ہے جو شفیق مرحوم کا مجموعہ کلام "متاع" شان دار اہتمام کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں زیادہ تر شفیق صاحب کے دور اول کی غزلیں اور مختلف ادوار کی قومی و سیاسی نظمیں ہیں ان کا اصلی رنگ اور حقیقی مقام ان کی دور ثانی اور دور آخر کی غزلوں اور نظموں ہی سے متعین کیا جا سکتا

ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ اُن کی تمام غزلوں نظموں اور مختلف اصناف سخن میں ان کا جو کلام ہے وہ سب یکجا کر کے ایک معیاری انتخاب شائع کیا جائے۔

ہمیں امید ہے کہ ایسے انتخاب کی اہمیت و ضرورت پر ارباب علم و ادب توجہ دیں گے ہماری دعا ہے کہ ادارہ انیس اردو اپنی شاندار خدمات اور تعمیری کارناموں سے نیک نام اور ترقی پذیر ہو اور ناسپاسی ہوگی اگر محترم جناب مولوی ریاض الدین صاحب پرنسپل مجیدیہ اسلامیہ کالج الٰہ آباد و جنرل سکریٹری ادارۂ انیس اردو الٰہ آباد کا شکریہ نہ ادا کیا جائے، دراصل موصوف ہی کی توجہ اور محنت کا یہ ثمرہ ہے جو "نشانہ" کی شکل میں ہدیہ ناظرین ہے۔

عزیز ربانی

اڈیٹر اردو نئی دنیا

جونپور

۲۶ اکتوبر ۱۹۶۳ء

"شفیق صاحب کا مجموعۂ کلام میری نظر سے گذرا ہے اور میں بجا طور پر اس سے متاثر ہوا ہوں، انھوں نے اپنے مجموعہ فانوس کا مقدمہ خود لکھا ہے کہ انھیں اعتماد ہے کہ ان کا کلام اہمیت حاصل کر لے گا۔ ان کی شاعری شعوری ہے جو حیات و کائنات کے مسائل پر مرکوز ہے۔ ہمیں اور آپ کو ان کے نظریات سے اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن ہم ان کی قدر کرنے پر مجبور رہیں ان کی شاعری میں کوئی الجھن نہیں ہے ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سماج کے دل کی دھڑکنیں ہیں۔ ان کی غزلیں اشاراتی ہیں اردو غزل صرف گل و بلبل کی داستان نہیں ہے میر نے اپنے دور کے انتشار کو خزینۂ شاعری کی شکل میں ظاہر کیا ہے شفیق صاحب کی شاعری بھی اسی شان کی شاعری ہے ان کے شعور میں ہندوستان سے بے پناہ محبت موجود ہے انھوں نے اپنے استاذ مولانا حسرت سے ایک الگ راستہ بنایا ہے شفیق صاحب نے بین الاقوامی مسائل پر نظر ڈالی ہے ان کی شاعری کے پیچھے ایک نظریہ ہے جس میں ایک شعور ایک سلیقہ اور لطافت و پاکیزگی ہے۔ میرے نزدیک بلا شبہ وہ صف اول کے شاعر ہیں۔"

(ڈاکٹر سید اعجاز حسین)

"شفیق صاحب مولانا حسرت موہانی کے شاگرد ہیں۔ مولانا لوگوں کو شاگرد نہیں بنایا کرتے تھے۔ انھوں نے شفیق صاحب کے اندر کوئی بلند چیز دیکھی ہوگی جہاں تک شفیق کی غزلوں کا تعلق ہے میں یہ کہوں گا کہ ایک اچھے غزل گو کے یہاں جو خصوصیات ہونی چاہئیں وہ سب ان کے یہاں موجود ہیں۔ یہ شفیق کی انفرادیت ہے کہ انھوں نے حسرت سے سلامت نشاط و غم اور عشقیہ عناصر کو لیتے ہوئے اپنی راہ کو الگ رکھی ہے۔ شفیق صاحب نے شعوری طور پر ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا ہے جو خلاقی عنصر حسرت کے یہاں اہم نہیں ہو پایا۔ شفیق صاحب نے شعوری طور پر ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا ہے جو اخلاقی عنصر حسرت کے یہاں اہم نہیں ہو پایا۔ شفیق صاحب کے یہاں غزل کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا۔ اس لحاظ سے شفیق نے رنگ حسرت کو ترقی دی ہے۔ اور ایک نیا رنگ پیدا کیا ہے۔ بہرحال شفیق کی شاعری زندگی کے ہر موڑ پر ایک انفرادی رائے کا اظہار ضرور کرتی ہے۔ وہ ہر شعبۂ حیات کے لئے ایک نظریہ رکھتے ہیں جس سے ہمیں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ادبی محاسن سے انکار مشکل ہے۔ حسرت کے یہاں صوفیانہ خیالات کی بہتات ہے اور شفیق کے کلام میں دبیر سوز و ساز ہے جس سے شفیق کی عظمت کا معیار قائم ہوتا ہے۔"

(پروفیسر سید احتشام حسین)

[illegible]

مہاتما گاندھی

خود روشنیٔ طبع بلا ہو گئی تجھے
اے چاند لے کے ڈوب گئی چاندنی تجھے

ہے کتنا پاس دیس کی عظمت کا بھی تجھے
قاتل گناہ گار ہے شرمندگی تجھے

ہندو ہے تو مگر ترے ایثار کی قسم
کرتا ہے یاد مجھ سا مسلمان بھی تجھے

آزادیٔ وطن کی کہانی تھی ناتمام
اب ختم ہو رہی تھی کہ نیند آ گئی تجھے

آواز دے رہے تھے تلک تجھ کو بار بار
کب سے پکارتے تھے محمد علی تجھے

گو نی ترے کلیجے کو کیا چھیدتی مگر
دینا تھا مر کے بھی سبق زندگی تجھے

تو پھر بھی موج موج سے بچکر نکل گیا
کشتی تو دی تھی قوم نے ٹوٹی ہوئی تجھے

کانٹے بھی ہیں چھپے ہوئے پھولوں کے بھیس میں
اے میرے باغباں یہ توقع نہ تھی تجھے

تو اور زندگی کی خوشامد غلط غلط
خود حشر تک تلاش کرے زندگی تجھے

جمنا میں تاب ہے کہ وہ تجھ کو ڈبو سکے
اک موج عشق تھی جو بہا لے گئی تجھے

تقسیم ہو گئی ترے رستوں میں تیری خاک
پھرتی رہے نسیم سحر ڈھونڈھتی تجھے

مہاتما جی کی راکھ

غم میں ترے پھولوں کا جگر چاک ہے شق ہے
شبنم ورقِ گُل پہ نہیں خونِ شفق ہے

اک سینۂ بے کینہ ہو گولی کا نشانہ
صد حیف یہ صدیوں کی غلامی کا سبق ہے

آزاد و جواہر ہوں کہ ہوں حسرت و محمود
واللہ کہ سب کو ترے جلنے کا قلق ہے

بے چین ہے سورج کہ تری راکھ کو چومے
کاندھوں پہ شعاعوں کے عقیدت کا طبق ہے

گاتی ہوئی لہر یہ لئے جاتی ہیں تری راکھ
ہر موج کی آغوش میں گیتا کا ورق ہے

کس پیار سے گیسو ترے بھارت نے سنوارے
اور آگ لگا دی گئی جمنا کے کنارے

پنہاں ہے تری راکھ میں بھی سوزِ صداقت
بن جائینگے جگنو ترے مٹی کے شرارے

چلنا ہے ابھی ملک کو تیرے ہی نشاں پہ
رو رو کے تری قوم تجھے کیوں نہ پکارے

آنند و جواہر سے تری شمع جلے گی
اب تو یہی دونوں ہیں تری آنکھ کے تارے

ہر تارِ نظر سے تجھے بھیجیں گے یہ پیغام
جاتے ہوئے سورج کی شعاعوں کے سہارے

احرار تری شمع کے پروانے بنیں گے
سینوں میں دلوں میں ترے کاشانے بنیں گے
جو لوگ تری طرزِ سیاست سے خفا ہیں
وہ بھی تری تہذیب کے دیوانے بنیں گے
خدام وطن آج ہیں بکھرے ہوئے لیکن
اک دن تری تسبیح کے سب دانے بنیں گے
خاموش ہے تو پھر بھی سخن زندہ ہے تیرا
برسوں ترے ہر لفظ سے افسانے بنیں گے
ساقی تری تعمیر کبھی ختم نہ ہوگی
تا حشر تری خاک سے پیمانے بنیں گے

مہاتما گاندھی اور عید

اشک برساتی ہوئی آئی پریشانوں کی عید
بے چراغ و شمع ہے ساون میں پروانوں کی عید

عید اب کے سال یوں محسوس ہوتی ہے مجھے
وادئ غربت میں جیسے دل کے ارمانوں کی عید

قاضی و مفتی جسے کہتے تھے دشمن دین کا
آج اُس کافر کو روتی ہے مسلمانوں کی عید

اے شوالے کے پجاری اللہ اللہ تیری شان
یاد کرتی ہے تجھے مسجد کے دربانوں کی عید

ہندو و مسلم گلے ملتے تو لطف عید تھا
آمرے گاندھی کہ ہو آشفتہ سامانوں کی عید

قطب کی درگاہ میں جمنا کے ساحل کے قریب
ڈھونڈھتی پھرتی ہے تجھ کو تیرے دیوانوں کی عید

گر وطن میں امن قائم ورنہ تو بھی یاد رکھ
کل گریباں گیر ہوگی چاک دامانوں کی عید

آج جواہر لال کو کالی گھٹاؤں سے بچا
آج اسی جگنو سے روشن ہے شبستانوں کی عید

لے گیا تجھ سے تلاطم بھی محبت کا سبق
اب تو موجوں سے گلے ملتی ہے طوفانوں کی عید

تیری دانائی سے مستقبل میں یہ اُمید ہے
دھوم سے ہوگی "اہنسا" کے نگہبانوں کی عید

ہیں اگر تیری دعائیں اپنے مستقبل کے ساتھ
ہم دکھا دیں گے کہ یوں ہوتی ہے مستانوں کی عید

ہو پیام جشن نو تہذیب حاضر کے لئے
تیرے تہخانوں کا جھولا اپنے میخانوں کی عید

دیس کی غربت پہ گریاں ہے شفیق دل فگار
تم کو زردار و مبارک اپنے ارمانوں کی عید

ٹیپو شہیدؒ

شمع کو جلنے دو پروانوں کی منزل کے قریب
کیوں بجھانے کے لئے لائے ہو محفل کے قریب

اور کچھ کہتا ہے ارمان شہادت لے اجل
ورنہ خود ٹھہرا اُٹھے تو صاحب دل کے قریب

تجھ کو قربانی کی دُھن تھی ورنہ اے ٹیپو شہیدؒ
اک قیامت اُٹھ کے آتی کوئے قاتل کے قریب

آج تک باقی ہے تیری حریت کی روشنی
پاک بینوں کی نگاہوں کے قریں دل کے قریب

آ رہی ہے حریت کی قدسیہ تیری طرف
کیا خبر تھی کچھ بگولے بھی ہیں محمل کے قریب

تازہ نغمے چھیڑنے والے تھے تیرے ہمنوا
ناگہاں زاغ و زغن پہونچے عنادل کے قریب

حیف آ پہونچے یکایک اک طرف سے راہزن
تو پہونچنے بھی نہ پایا اپنی منزل کے قریب

وہ جبیں کا رعب وہ ہمت وہ اطمینانِ قلب
شیر کی آواز گونجی اہل باطل کے قریب

تجھ کو اے دریائے کاویری مبارک ہو یہ فخر
اک مجاہد سو رہا ہے تیرے ساحل کے قریب

مجاہد ریف امیر عبدالکریم

(الجزائر کی جنگ آزادی کے پس منظر میں)

جسے قطرہ سمجھتے ہو وہی طوفاں نہ بنجائے
فلک سہما ہے ذرّہ نیرّ تاباں نہ بنجائے

پریشاں ہو رہے ہیں خرمن باطل کے دیوانے
کہ چنگاری کہیں پھر آتشِ سوزاں نہ بنجائے

اُٹھے ہیں جوش میں بل کھا کے بادِ تند کے جھونکے
کہ مرجھایا ہوا غنچہ گل خنداں نہ بنجائے

ابھی جس نے رہائی پائی ہے قید سلاسل سے
وہ زندانی وطن کا یوسف کنعاں نہ بنجائے

کیئے دیتا ہے دشمن کو ہراساں پھر یہ اندیشہ
مراکش کا مسلماں فاتح دوراں نہ بنجائے

امیر ریف تجھ پر اس لئے اعدا کی نظریں ہیں
کہ تو حریت و انصاف کا عنواں نہ بنجائے

زیب النساء مخفیؔ

مجھے چونکا رہا ہے انقلاب روزگار ابتک
مگر آنکھوں میں ہے خواب گذشتہ کا خمار ابتک

حوادث رونما ہیں بے ثباتی کارفرما ہے
ہمیں ہے اعتبار ہستی ناپائدار ابتک

دبے ہیں کیسے کیسے لوگ ان مٹی کے تودوں میں
کہ جنکی خاک پر ہے نامرادی اشکبار ابتک

غریق رحمت حق ہوں مرے اسلاف کی روحیں
کہ جن کے کارناموں سے ہے قومی اقتدار ابتک

نشانِ گور بھی گو مٹ چکا ہے آج مخفی کا
مگر تاریخ میں محفوظ ہے اسکا وقار ابتک

وہ مخفی شاہزادی تھی جو عالمگیر کی بیٹی
کہ قدرت جس پہ کرتی ہے درِ شبنم نثار ابتک

رہا کرتا ہے چرچا اسکے علمی کارناموں کا
ضیائیں دے رہی ہے اسکی شمع اقتدار ابتک

کیا ہے فارسی میں ترجمہ تفسیر رازی کا
لیا جاتا ہے نام اسکا بناز و افتخار ابتک

نہیں ہے آج تو موجود اے زیب النساء لیکن
ترے اشعار ہیں دنیا میں تیری یادگار ابتک

ترے ابیات سے بیت ادب کی زیب و زینت ہے — سخنداں جھوم جھوم اُٹھتے ہیں یکسر بار بار ابتک

ترے اشعار سے معمور ہے کاشانۂ شاعر — نکلتی ہے صدائے آفریں بے اختیار ابتک

ترنم مطربان دہر کے بدلا کئے لیکن — ترے نغمات ہیں بزم سخن میں خوشگوار ابتک

تری پاکیزہ نفسی پر نسائیت کو دعوا ہے — تری تصویر ہے نور نگاہ اعتبار ابتک

بہت اغیار نے بے اصل افسانوں کو شہرت دی — حیا کرتی ہے لیکن تیری معصومی کو پیار ابتک

تری عظمت پہ ہے تاریخ اسلامی کو ناز ایسا — کہ ٹکراتی ہے گردوں سے کلاہ افتخار ابتک

نشان رفتگاں ملتا نہیں کچھ راہ ہستی میں — اسی حسرت میں سر دھنتا ہے منزل کا غبار ابتک

صبا تجھ کو مرے بچھڑے ہوئے ملجائیں تو کہنا
کہ تم کو یاد کرتا ہے **شفیق** دلفگار ابتک

زیب النساء مخفیؔ

(یہ نظم تقسیم ہند سے پہلے کی ہے)

خاموشیوں کے گہوارے میں اک حورِ مجسم سوتی ہے
مشرق کی دُلہن کیا جانے کیوں بادیدۂ پرنم سوتی ہے
اس نیند پہ بیداری قرباں، تاریخ بلب عبرت کی زباں
بالین لحد پر نصب کئے احساس کا پرچم سوتی ہے

کیوں چھوڑ کے سلطانی مسند جانانۂ عالم سوتی ہے
اک اُجڑے ہوئے ویرانے میں روٹھی ہوئی بیگم سوتی ہے
آثار اب وجد کی رونق، ہر ابیض و اسود کی رونق
شام سرِ لیلیٰ سوتی ہے صبح رخ مریم سوتی ہے

وہ خواب گہہ تنہائی میں ریحانۂ عالم سوتی ہے
شہزادی دوراں سوتی ہے سلطانۂ عالم سوتی ہے
اے ذوق تکلم سو تو بھی جب شعر و ترنم کی دیوی
خوابیدہ نگاہوں میں لے کر افسانۂ عالم سوتی ہے

غنچوں کی لطافت سوتی ہے پھولوں کی جوانی سوتی ہے
اے خاکِ وطن اب بھی تجھ میں جنت کی نشانی سوتی ہے
یہ تابشِ رُخ کی خاموشی اُف زلف کی یہ ظلمت پوشی
اک صبح کی دیوی سوتی ہے اک شام کی رانی سوتی ہے

اک جانِ زلیخا سوتی ہے، اک آسیہؑ ثانی سوتی ہے
تہذیب کی پتلی سوتی ہے، سلمائے معانی سوتی ہے
تھا تیرا پیام بانگ درا، دنیا کے لئے پیغام حرا
مخفی تری اک اک کروٹ میں صدیوں کی کہانی سوتی ہے

گو تو نہ سہی تاریخ تری خود کار مسیحا کرتی ہے
مخفی ترا مرنا مرنا ہے مرنے کو تو دنیا مرتی ہے
اُٹھ اُٹھ ترا منہ دھلوانے کو، گلشن میں تجھے نہلانے کو
تسنیم کے پانی سے شبنم کلیوں کی صراحی بھرتی ہے

مغلیہ جلالت یہ کہہ کر اب تیرے سرہانے رُوتی ہے
صد حیف وہ زیرِ خاک چھپے جو تاجِ شرف کا موتی ہے
اگلا وہ زمانہ سطوت کا اور آج یہ عالم حسرت کا
کل سوتے ہوئے جاگ اُٹھتے تھے اب جاگنے والی سوتی ہے

آ آ کہ بچھائے رہتے ہیں بزمِ صفِ ماتم تیرے لئے
گل چاک گریباں تیرے لئے خونبار ہے شبنم تیرے لئے
وہ تیرا مذاق علم و ہنر آراستہ بزمِ اہلِ نظر
جھکتا تھا جہاں تہذیب کا سر آنکھیں ہیں مری نم تیرے لئے

اک حسن سراپا تیرے لئے اک نورِ مجسّم تیرے لئے
آرائشِ ہستی تیرے لئے زیبائشِ عالم تیرے لئے
عصمت کی نظر کا نور ہے تو عفت کے چمن کی حور ہے تو
تعظیم و ادب سے جھکتی ہے ہر بیگم و خانم تیرے لئے

خمسہ بر قطعۂ علامہ اقبالؒ

ھے بڑھی ہے اگر ابتلا کی تاریکی   اٹھے اٹھی ہے جو ظلم و جفا کی تاریکی
مجھے ڈرا نہیں سکتی بلا کی تاریکی   مجھے مٹا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی

نہ دیکھ سوئے فلک ہو کے بیکس و تنہا   کہ ہے خدا کی زمیں جدوجہد کی دنیا
چمک کے وادیِ غربت کی ظلمتوں کو مٹا   تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی ذات کو داغِ جگر سے نورانی

صبح کا ترانہ

سحر منہ سے برقع ہٹانے لگی — تو ساری فضا جگمگانے لگی
چلی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس طرح — ستاروں کو بھی نیند آنے لگی
اُٹھا پردۂ شب اُجالا ہوا — عروس حیا منہ چھپانے لگی
وہ مرغ سحر بانگ دینے لگا — وہ شمع سحر جھلملانے لگی
شوالوں میں ناقوس بجنے لگا — مؤذن کی آواز آنے لگی
چلی وہ نسیم مسیحا نفس — کہ دل کی کلی مسکرانے لگی
بہ تسبیح و تقدیس ہر شاخ گل — جبین اطاعت جھکانے لگی
اُتر آئیں حوران خلد بریں — سواری حسینوں کی آنے لگی
سر شاخ گل بلبل خوشنوا — چہکنے لگی چہچہانے لگی
ہوئے قافلے سوئے منزل رواں — مسافر اُٹھے رات جانے لگی

خوش آگئیں مناظر جو دیکھے شفیق
تو صبح ازل یاد آنے لگی

میرا دیس

اللہ رے مرے دیس کی شاداب فضائیں   آتی ہوئی جنّت کے دریچوں سے ہوائیں
تہواروں کے میلے کہیں تیرتھ کی سبھائیں   پھاگن کے ہیں جھونکے کبھی ساون کی گھٹائیں

اللہ اللہ رے مرا دیس ہوگا

زاہد کی مناجات ہے سادھو کی دعائیں   آتی ہیں کہیں کرشن کی بنسی کی صدائیں
دیکھیں جو شوالے کی پجارن کی ادائیں   شوخان کلیسا بھی جبینوں کو جھکائیں

اللہ اللہ رے مرا دیس ہوگا

جمنا ترے شاداب کناروں پہ نظر ہے   گنگا ترے بہتے ہوئے دھاروں پہ نظر ہے
بھیگے ہوئے ساون کی پھواروں پہ نظر ہے   بھارت ترے آغوش کے پیاروں پہ نظر ہے

اللہ اللہ رے مرا دیس ہوگا

رادھا کہیں سیتا کہیں لچھمن ہیں کہیں رام   ہر سمت سے دیتا ہے کوئی پریم کا پیغام
نظروں میں ہے حسنِ رخ و گیسوئے سیہ فام   کاشی ہے مری صبح تو متھرا ہے مری شام

اللہ اللہ رے مرا دیس

پیپل کے درختوں کے تلے صبح وطن دیکھ   مندر کی بلندی پہ وہ سورج کی کرن دیکھ

اک سمت پجارن کا عروسانہ چلن دیکھ
پاکیزہ نگاہیں ہوں تو گھونگھٹ کی پھ

اللہ رے مرا دیس

مسجد کے نمازی ہوں کہ مندر کے پجاری
دونوں کے قدم چومتی ہے باد بہار
اس باغ میں آتی ہے شہِ گل کی سواری
مالن کہیں سلمیٰ ہے کہیں راجکمار

اللہ رے مرا دیس

ناقوس کی آواز اذانوں کی صدا بھی
دل کفر در آغوش بھی ہے قبلہ نما بھی
بت خانہ کا جلوہ بھی ہے کعبہ کی ضیا بھی
ہے وحدت اقوام میں توحید خدا بھی

اللہ رے مرا دیس

راحت کی نشستیں کہ محبت کے ہوں پہلو
آنکھوں سے مسرت کے نکل پڑتے ہیں آنسو
سکھ ہوں کہ مسلمان کہ عیسائی کہ ہندو
سب ایک ہی ماتا کے ہیں بکھرے ہوئے گیسو

اللہ رے مرا دیس

یہ دھان کے کھیتوں کی خوش آیند بہاریں
سرسبز چراگاہوں میں ہرنوں کی قطاریں
سورج کی شعاعیں کہیں گھاٹی کی پھواریں
کیونکر یہ مناظر نہ نگاہوں کو سنواریں

اللہ رے مرا دیس

یہ جوئے رواں اور یہ تالاب یہ چشمے
اب بھی نہ بجھے پیاس تو قسمت کے کرشمے

حُبِّ وطن

اسی بستی میں رہنے دو غزلخواں ہم نہ جائینگے
سنو اے ساکنانِ شہر جاناں ہم نہ جائینگے

کبھی تو کام آجائیگا ایثارِ وفاداری
بلا سے ہو رہا ہے خون ارزاں ہم نہ جائینگے

نہ چھوڑیں گے کبھی اے مادرِ ہندوستاں تجھ کو
ستائے لاکھ ہم کو چرخ دوراں ہم نہ جائینگے

چمن میں دے رہے ہیں دھمکیاں جو پھونکدینے کی
وہی ہونگے نشیمن کے نگہباں ہم نہ جائینگے

اسی گلزار کی مٹی ہے جب تعمیر میں شامل
یہیں بنجائینگے خاک گلستاں ہم نہ جائینگے

اگر ہم اہل جوہر ہیں تو ہوگی قدر جوہر کی
جو آہر لال سا ہے میر ساماں ہم نہ جائینگے

یہاں گر اختلافِ سبحۂ و زنار کا ڈر ہے
وہاں بھی ہوگی بحث کفر و ایماں ہم نہ جائینگے

یہاں چلتے ہیں جھونکے باد صرصر کے تو اے ساتھی
وہاں بھی آندھیاں ہیں فتنہ ساماں ہم نہ جائینگے

جو بکتی ہے یہاں دوشیزگی بازار دولت میں
وہاں بھی چاک ہے عصمت کا داماں ہم نہ جائینگے

یہاں گردیویاں مغرب کی پریاں بنتی جاتی ہیں
وہاں بھی ہوچکا ہے حسن عریاں ہم نہ جائینگے

یہاں انسانیت سرِ در گریباں ہے اگر پیارے
شرافت اسطرف بھی ہے پشیماں ہم نہ جائینگے

یہ مانا بھائی بھائی میں یہاں تلوار چلتی ہے
چمکتی ہے وہاں بھی تیغ براں ہم نہ جائینگے

یہاں صدیوں سے محو خواب ہیں اسلاف کی روحیں
محبت ہے اسی مٹی پہ نازاں ہم نہ جائینگے

یہ جلسے یہ نمائش اور یہ بازار کی رونق
یہ خیموں میں دل آویزی کا ساماں ہم نہ جائینگے

دکانوں پر نظر آتے ہیں ہندو بھی مسلماں بھی
یہ میلے یہ بہار کفر و ایماں ہم نہ جائینگے

ہیں سرگرم خرام ناز خوبانِ وطن دیکھو
کہاں ملتے ہیں یہ غارت گر جاں ہم نہ جائینگے

فضا گنگ و جمن کی جانفزا ساحل کے نظارے
ہمارا دیس ہے یا باغ رضواں ہم نہ جائینگے

وہاں چرچا اگر اقبال کے درسِ خودی کا ہے
یہاں بھی ہے شفیق آگاہ عرفاں ہم نہ جائینگے

صبحِ وطن

یہ ہری شاخیں یہ چڑیوں کے ترانوں کا سماں   آفریں صد آفریں اے خطۂ ہندوستاں

ڈالیاں ہیں یا عروسانِ سحر کی ڈولیاں   جیسے جھولے جھولتی ہوں کرشن جی کی گوپیاں

گنگناتی ہے ہوا کی لہر میں یوں پات پات

جیسے گاتی ہو کوئی شیراز کی شاخِ نبات

ہند کے خطے زمیں کے شاہ پارے ہو گئے   جن سے حیراں آسماں کے چاند تارے ہو گئے

ماہ و انجم کی شعاعوں کے سہارے ہو گئے   ذرّے میری خاک کے سورج کے پیارے ہو گئے

کس قدر زرخیز ہے شاداب بھارت کی زمیں

جیسے بھارت کی زمیں دنیا میں جنت کی زمیں

یہ سحر کا وقت یہ پاکیزہ عالم آفریں   صبح کی کرنوں میں گوہر ہائے شبنم آفریں

کس قدر کیف آفریں ہے وقت و موسم آفریں   ہند یا دارالسلام ابنِ آدم آفریں

شاخِ گل ہے سایہ افگن چتر و پرچم کی طرح

گھاس بھی اُگتی ہے اس خطے میں ریشم کی طرح

یہ دسمبر کا مہینہ کھیت کے پودے جواں — پھول ہیں سرسوں کے یا بیٹھی ہوئی ہیں تت

ریلوے اسٹیشنوں کی لائنیں ہیں کیاریاں — کھیت کی پگڈنڈیاں ہیں یا زمیں کی کہک

خوشنما گیندے کے پھولوں میں ہے فطرت کے اصول

ننھی ننھی پتیوں کے جھرمٹوں میں زرد پھول

پوس کی سڑی جوانی پر ہوا میں خنکیاں — ابر کے ٹکڑے ہیں یا تارے ہیں کمل میں نہا

یہ کہر ہے یا سحر کی شمع محفل کا دھواں — یا عروسِ صبح کے ہمراہ گرد کارواں

لعل اگلتی ہے زمیں رنگیں مقامی دیکھئے

ہاں جواہر لال کی خوش انتظامی دیکھئے

نرم پیتوں کو زمیں کے ساز و ساماں کیلئے — موتی شبنم نے دیے تزئین داماں کیلئے

پھول گوبھی کے نمو پر ہیں بہاراں کیلئے — یا بنائے ہیں زمیں نے تاج دہقاں کیلئے

دھوپ میں جاڑوں کی میداں کی بہاروں کو نہ پوچھ

گنے ہیں خضر و مسیحا سبزہ زاروں کو نہ پوچھ

میٹھے میٹھے وقت کے شیریں نظاروں کو نہ پوچھ — رس بھرے گنے کے پودوں کی قطاروں کو نہ پوچھ

گاؤں کے تالاب پر خورشید پاروں کو نہ پوچھ — سیڑھیوں پہ آرزوؤں کے سہاروں کو نہ پوچھ

کیا تقاضائے نظر ہوتا ہے پنگھٹ دیکھ کر

سر پہ گاگر دیکھ کر چہرے پہ گھونگھٹ دیکھ کر

پاکستان کا خط

بلا رہی ہو کراچی میں تم ہمیں لیکن
وہاں وطن کا نظارا کہاں سے لائینگے

بجا کہ ساحل راوی ہے پر بہار مگر
یہ گومتی کا کنارا کہاں سے لائینگے

درست ہے کہ ملیں گے نئے نئے احباب
وہ جونپور ہمارا کہاں سے لائینگے

کہاں سے گا بنارس کی صبح کا منظر
اودھ کی شام دل آرا کہاں سے لائینگے

جو یاد آئے محرم کے شاندار جلوس
تو لکھنؤ کا نظارا کہاں سے لائینگے

نہ دل سے جائیگا شوق زیارتِ اجمیر
یہ درگہ چمن آرا کہاں سے لائینگے

جو یاد آئی شبِ ماہ و سیرِ تاج محل
پری وشوں کا اشارا کہاں سے لائینگے

فلک کے چاند ستارے کہاں نہیں لیکن
یہ فرش خاک کا تارا کہاں سے لائینگے

جو قبریں اپنے بزرگوں کی یاد آئیں گی
بتاؤ ضبط کا یارا کہاں سے لائینگے

یہ چترکوٹ یہ کاشی یہ رود گنگ و جمن
تمھیں بتاؤ خدارا کہاں سے لائینگے

کہاں ملیں گے وہاں ہم کو ڈاکٹر محمود
ابوالکلام سا پیارا کہاں سے لائینگے

ہم اہل ہند کے درد آشنا جواہر لال
تری نظر کا سہارا کہاں سے لائینگے

ہو لاکھ مرکز اردو کراچی و لاہور
شفیق سا سخن آرا کہاں سے لائینگے

اچھوت

اخلاق کا دیتے ہیں سبق اہل رضا اور
کہتا ہے مگر شیوۂ ارباب جفا اور
قیصر کی ادا اور ہے انداز گدا اور
منعم کا خدا اور ہے مفلس کا خدا اور
انسان سمجھنے لگے انسان کو خوار آج
سنتا ہی نہیں کوئی اچھوتوں کی پکار آج
یارب ترے بندوں میں نہیں انکا شمار آج

کب شاخ چمن انکے نشیمن کے لئے ہے
یہ قوم فقط نالۂ و شیون کے لئے ہے
دولت نہ زمیں خانہ و مسکن کے لئے ہے
مندر بھی اگر ہے تو برہمن کے لئے ہے
اللہ رے تاثیر جراثیم غلامی
چھو جائیں جو ان سے تو ہے اعزاز کی خامی
گویا کہ اچھوتوں کو سمجھتے ہیں جذامی

او ناز کے ہاتھوں کے کھلائے ہوئے بندے — یہ بھی ہیں خدا ہی کے بنائے ہوئے بندے
بپھریں نہ کسی دن یہ ستائے ہوئے بندے — اُبھرینگے یہ مٹی میں ملائے ہوئے بندے

پرسانِ مآل غربا کوئی نہیں ہے
غربت کے سوا انکی خطا کوئی نہیں ہے
جیسے کہ اچھوتوں کا خدا کوئی نہیں ہے

ہشیار کہ اے نخوتِ اعزاز کے بانی — کرتا ہے سروشں ازلی زمزمہ خوانی
سنتا ہے خدا ٹوٹے ہوئے دل کی کہانی — تلوار کی جھنکاروں پہ گائے گی جوانی

گرنبد در فتنہ و بیداد نہ ہوگا
جبتک کہ اخوت کا سبق یاد نہ ہوگا
انسان حقیقت میں کبھی شاد نہ ہوگا

حکومت کیا کرے

عقل ہی میں زنگ لگ جائے تو فطرت کیا کرے
ذہن لاغر ہو تو بازوئے سیاست کیا کرے

ہو جہاں زور نفاق و کینہ و بغض حسد
پھر وہاں کوئی تمنائے اخوت کیا کرے

ناگوار طبع ہوتی ہو جہاں بوئے وفا
اس فضا میں کوئی اعلان محبت کیا کرے

ساری بستی میں ہو جب سمیّت آب و ہوا
ہو مسیح الملک بھی تو فکر صحت کیا کرے

عام ہو جائے اگر ثقل سماعت کا مرض
بوالکلام آزاد کا جوش خطابت کیا کرے

پست جب ہو جائے معیار شرافت ملک میں
ڈاکٹر محمودؔ کی شانِ سیادت کیا کرے

جب دبایا جا رہا ہو قوم کی آواز کو
پھر حیات اللہ انصاری کی غیرت کیا کرے

کوئلے پھیلے ہوں جب مٹی کے تودوں کی طرح
چاندنی فرشِ زمیں بنکر بھی خدمت کیا کرے

دوپہر تک سو کے جب بستر سے اٹھتا ہو کوئی
خنکیِ بادِ سحر کی قدر و عزت کیا کرے

صبح سے تا شام جب کالی گھٹا چھائی رہے
لاکھ سورج تیز ہو سامانِ طلعت کیا کرے

کوڑے کرکٹ میں جہاں مالی کو نیند آتی رہے
اس چمن میں موسمِ گل کی لطافت کیا کرے

مدتوں سے ہو جہاں ذہنی غلامی کی وبا
آئے آزادی تو اظہارِ مسرت کیا کرے

لاکھ آئین و ضوابط ہوں مکمل اے شفیق
آدمی اچھے نہیں ملتے حکومت کیا کرے

سندھی لڑکے کے قاتل سے خطاب

شہر کے امن کو پھر مورد آلام کیا
روسیاہی نے تری صبح کو بھی شام کیا
مصطفےٰ نام مگر بولہبی کام کیا
تو نے اسلام کی تہذیب کو بدنام کیا

کھو دیا عظمت و اخلاق کا جوہر تو نے
بیچ ڈالا جسے تھوڑی سی رقم پر تو نے

تجھ سے رہزن جو پھریں گے سربازار وطن
دیکھتے دیکھتے لٹ جائے گا گلزار وطن
دیس میں ہونگے اگر تجھ سے جرائم پیشہ
لوگ سمجھیں گے شریفوں کو بھی غدار وطن

تجھسے غنڈے کیلئے اپنا وطن موزوں تھا
کب ترے حق میں شریفوں کا چمن موزوں تھا

اک تعفن ہے تری ذات شرافت کیلئے
کوڑھ کا داغ ہے تو دامن ملت کیلئے
مشتبہ تجھ سا ہوا قوم کا کردار افسوس
تھا مسلماں کبھی غیروں کی حفاظت کیلئے

اے یزیدوں کے رفیق اہل شقاوت کے حبیب
تجھسے نالاں ہے حسین ابن علی کی تہذیب

شاعر سے خطاب

اے شاعرِ حساس وہ بیدار صدا دے — جو سوئی ہوئی قوم کو پیغامِ بقا دے
جو نالہ ہو یا بانگِ جرسِ راہِ وطن ہو — آوارۂ غربت کو جو منزل کا پتا دے
نکلے ترے سینے سے وہ اک آہِ شرربار — جو خرمنِ باطل میں بھی اک آگ لگا دے
ناگاہ ترے نعرۂ پرعزم کی ہیبت — سرمایہ پرستی کی عمارت کو گرا دے
اُٹھ اُٹھ کہ ترے پاؤں کی شفقت بھری ٹھوکر — مزدور کی سوتی ہوئی قسمت کو جگا دے
ممنونِ تسلّی ہو یتیم جگر افگار — بیوہ، کو جو تقدیر کو روتی ہے ہنسا دے
آ آ کہ ترے ہاتھ کا پیمانۂ لبریز — رندوں کو نئے سر سے جواں سال بنا دے
اے مستِ مئے ساغرِ صہبائے جوانی — آ خانقہِ شیخ کو میخانہ بنا دے
ہوتی ہے جہاں جُبّہ و دستار کی پوجا — اس آذری تہذیب کے بتخانے کو ڈھا دے
ظلمت کدۂ دہر میں وہ شمع جلا تو — تاریک فضاؤں میں جو فاراں کی ضیا دے

دشوار، کہ رو کے تجھے دیو رہِ ظلمت
مشکل، کہ تری شمع کو پھونکوں سے بجھا دے

بدمست شاعر

کم ظرف نہ کر اب ہوسِ جامِ شراب اور
پی کر ہوئی جاتی ہے تری عقل خراب اور

تو اور یہ میخانہ یہ انگور کی بیٹی
ہے شاعرِ فطرت کا تقاضائے شباب اور

پیتا ہے اگر آگ کو پانی کیطرح تو
ہے گرمیِ افکار پہ یہ تازہ عذاب اور

کیوں حافظِ شیراز کا بنتا ہے مقلّد
رندوں کی شراب اور ہے شاعر کی شراب اور

کیا مطرب و رقاصۂ محفل کی ضرورت
اربابِ سخن کیلئے ہے چنگ و رباب اور

کیسی ہوسِ بالش و بالینِ حسیناں
ہوتی ہے مفکر کیلئے راحتِ خواب اور

تو اور سرِ شام بتِ شوخ سے باتیں
قدرت کے مغنی کی ہے دنیائے خطاب اور

دن رات تجھے شیخ کی تضحیک ہے مرغوب
ہشیار کہ دو روز ہے تیرا بھی شباب اور

کیوں ضابطۂ حرمت و حلّت سے ہے انکار
کیا تیرے لئے عرش سے اُترتی ہے کتاب اور

شاعر سببِ پاکیِ اخلاق و ادب تھا
تجھ سے تو بڑھی جرأتِ رندانِ خراب اور

بدمست کو ہم چھیڑ کے پچھتائے شفیق آج
کرتے تھے سوال اور وہ دیتا تھا جواب اور

کالج کی صبح

نور برساتی ہوئی حورِ سحر آتی ہے — زندگی کیلئے پیغام طرب لاتی ہے
یعنی تاریکیٔ اوہام مٹی جاتی ہے — صبح کالج کے جوانوں کی قسم کھاتی ہے
وہ جوانی جو تمناؤں کو گرماتی ہے — کالجوں کے در و دیوار پہ لہراتی ہے

عزّتِ قوم کا فردوس ہے کالج کا مقام — امرا و غربا ایک ہی صف میں ہیں تمام
نوجواں اور جواں بخت ہیں سرگرم خرام — وقت آیا ہے کہ بدلیں گے زمانے کا مقام
صبح نو لائی ہے بیداریٔ مشرق کا پیام — زندگی وقت غلامی ہے تو جینا ہے حرام

نوجوانو نگہ اہل وطن ہے تم پر — صدقے اپنی سحر نو کی کرن ہے تم پر
ملتوی فیصلۂ دار و رسن ہے تم پر — فرض، بربادیِ دستور کہن ہے تم پر
نگہ ناز عُروسانِ چمن ہے تم پر — چشم بد دور جوانی کی پھبن ہے تم پر

آہ سرمایہ پرستوں کی جہالت کی نظر
رحم و شفقت کی نظر ہے نہ حمیت کی نظر
تھیں اللہ نے بخشی ہے بصیرت کی نظر
عزم و ایثار کا احساس حقیقت کی نظر
آدمی کیا جو نہ رکھتا ہو شرافت کی نظر
بشریت کی بلندی ہے صداقت کی نظر

راہ دشوار ہے مسموم ہوا دھوپ شدید
پھر بھی آباد کیے دیتے ہو دنیائے جدید
تم سے سیراب ہوئی سوکھی ہوئی کشتِ اُمید
بن گئی شام غریباں سحر جلوۂ عید
للہ الحمد ہر آں شے کہ دل او را طلبید
آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

سفر منزل پر خوف و خطر تم نے کیا
کام یہ پیشیروں کا تھا مگر تم نے کیا
خضر حیران ہیں جہاں عزم سفر تم نے کیا
یاس کی شام کو راحت کی سحر تم نے کیا
احترام شرفِ اہل نظر تم نے کیا
جوش کو جوش، جگر کو بھی جگر تم نے کیا

شاعر کا پیام نوجوانانِ کالج کے نام

خارِ رہِ غم پائے خراماں سے نکالو
ہر پھانس کو تم سوزنِ مژگاں سے نکالو
اب شامِ غریباں کو بیاباں سے نکالو
صیاد کو گلچیں کو گلستاں سے نکالو
پستی کا تخیل دلِ انساں سے نکالو

—— کالج کے جوانو ——

مزدوروں کسانوں ہی کا تم راگ نہ گاؤ
محدودسی آواز کو نغمہ نہ بناؤ
ہر بیکس و نادار کو خوشحال بناؤ
تم ملک سے غربت کے جراثیم مٹاؤ
پھر شوق سے ہر ظلم کی بنیاد ہلاؤ

—— کالج کے جوانو ——

سانچے میں ترقی کے غریبوں کو بھی ڈھالو
بھائی کی طرح قوم کے بچوں کو بھی پالو
بیوہ پہ کرو رحم یتیموں کو سنبھالو
ہر بیکس و نادار کو سینے سے لگا لو
ہر ایک سفینے کو تباہی سے بچا لو

—— کالج کے جوانو ——

بہتے ہوئے دھاروں میں بہوا کرے پیارو
کیوں بیٹھ کے ملاح کو ساحل سے پکارو
بوسیدہ ردائے شب تمنا سے اُتارو
شہزادی امید کی زلفوں کو سنوارو
اے شوکت و اقبال کی آنکھوں کے ستارو
——کالج کے جوانو——

گاؤ نہ فقط ساز بغاوت پہ ترانے
کچھ اور بھی کہتے ہیں جو دیکھے ہیں زمانے
اسباب فراہم کرے کچھ دل ہیں جو ٹھانے
اپنا تو یہ عالم ہے کہ دولت نہ خزانے
ہیں کاکل تدبیر میں الجھے ہوئے شانے
——کالج کے جوانو——

باغی نہ بنو پہلے بنو مرد سپاہی
بن جاؤ سپاہی تو جھکے شوکت شاہی
اُٹھو جو مٹانا ہے مقدر کی سیاہی
شہباز کی پرواز ہے پیغام تباہی
دیکھے نہ کبوتر تو یہ کوتاہ نگاہی
——کالج کے جوانو——

بنائے ارتقاء

نکل کر قعرِ پستی سے بنائے ارتقا ڈالو
اٹھو اے نوجوانو اک نئی دنیا بنا ڈالو

تمھارے سامنے ہے پست ہر مخلوق کا رتبہ
تم اپنے فرق پر کیوں سایۂ بالِ ہما ڈالو

سمجھ رکھا ہے جن کو ناتواں آج اک زمانے نے
انھیں ہاتھوں سے تم چاہو تو دنیا کو ہلا ڈالو

تمھیں تو ہو رہے ہو زنگ خوردہ اپنی غفلت سے
تمھیں چاہو تو ہر شیشے کو آئینہ بنا ڈالو

تنقید کی جرأت

نہ موجد ہوں نہ طرزِ عام کی تقلید کرتا ہوں
مجھے تنقید کی عادت ہے میں تنقید کرتا ہ

تمھاری لغزشوں پر ٹوک دیتا ہوں متانت سے
تم اچھی بات کہتے ہو تو میں تائید کرتا ہو

مرا زورِ قلم رکھتا ہے قوموں کی توانائی
وطن کی شام کو میں رشکِ صبحِ عید کرتا ہ

کبھی ڈوبی ہوئی کشتی کو میں لاتا ہوں ساحل تک
کبھی گزرے ہوئے طوفان کی تجدید کرتا ہو

جہاں میں پھیل جاتی ہے بہت جب رسمِ سفاکی
فرشتے دیکھ کر ہنستے ہیں انسانوں کی بیبا

غرورِ بانیانِ ظلم و شر جب حد سے بڑھتا ہے
ستم ڈھاتی ہے جب شہ زورِ غدار دنیا کی چالا

تو پھر میری صدا بیدار کر دیتی ہے ذہنوں کو
مٹا دیتا ہوں سینوں سے بداخلاقی کی ناپاکی

ہمیں شمعیں جلانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی
سراپا روشنی ہے خود ہمارا پیکرِ خاکی

یہ شیخ و برہمن کی خود پرستی کا ستم کب تک
خدا کے نام پر آویزشِ دیر و حرم کب تک

کوئی مندر گراتا ہے کوئی مسجد کو ڈھاتا ہے
یہی مذہب کا حاصل ہے تو مذہب کا بھرم کب تک

انھیں فتنوں سے ہے بنامِ مذہب نوجوانوں میں
بنامِ حق پرستی کذب و باطل کا علم کب تک

اگر ہوتا رہیگا خون انصاف و عدالت کا
نہ اُٹھے گا شفیق جونپوری کا قلم کب تک

ساقی

ہمارا میر میخانہ بھی کیا ہشیار ہے ساقی
کہ آنکھیں سو رہی ہیں اور دل بیدار ہے ساقی

بہت حالات نے چاہا خودی کو ختم کر دینا
مگر تیرے جوانوں کی وہی رفتار ہے ساقی

یہ جھک جائیں تو فرق آجائے میخانے کی عظمت پر
انھیں سے حریت کی گرمیٔ بازار ہے ساقی

زمانہ چاہتا ہے شیشہ و ساغر کو ٹکرانا
تو میخانے میں بھی آتش فشاں تیار ہے ساقی

اگر میری وفاداری کو ٹھکراتی رہی دنیا
تو پھر ہاتھوں میں ساغر کی جگہ تلوار ہے ساقی

کہیں ایسا نہ ہو یہ کہہ کے اٹھیں تیرے مستانے
رواداری کہاں تک زندگی دشوار ہے ساقی

وہ ابن الوقت جو لرزاں ہیں تیغوں کی جھنا جھن میں
وہاں جائیں جہاں پازیب کی جھنکار ہے ساقی

بڑھاتا جا تو اپنے نونہالوں کی امنگوں کو
انھیں کاندھوں پہ قومی زندگی کا بار ہے ساقی

جگہ کر دی گئی مخصوص لیکن اُف رے بدنظمی
نشستوں پر ترے عشاق میں تکرار ہے ساقی

جو قیمت دے تو پی لے ورنہ پیاسا ہی چلا جائے
تو کیا سمجھوں تری محفل ہے یا بازار ہے ساقی

محبت کا صلہ یہ ہے محبت تو بھی کر مجھ سے
جبیں رکھتا نہیں قدموں پہ جو خوددار ہے ساقی

جو پیاسوں میں بھی اپنے اور بیگانے کا قائل ہو
تو ایسے میر محفل پر خدا کی مار ہے ساقی

ذرا اپنے کرم سے بھی تو کرنا تھا سوال آخر
ہمیں سے کیوں برابر پرسش ایثار ہے ساقی

تری آنکھوں کو میکش نرگس بیمار کہتے تھے
اور اب خود پینے والی کی نظر بیمار ہے ساقی

ساقی

مخالف ہو فضا کیوں رند ہمت ہار دے ساقی
ہٹا مینا و ساغر لا مجھے تلوار دے ساقی

نہ بیچوں گا کسی قیمت پہ تیری پی ہوئی مے کو
مجھے تو چاہیے سارا خانۂ خمار دے ساقی

گوارا کر نہیں سکتا ہوں قیدیں جام و صہبا پر
زمانہ جسقدر چاہے مجھے آزار دے ساقی

کبھی تو دیکھ میری شان ارجن کی کماں دے کر
کبھی ہاتھوں میں تیغ حیدر کرار دے ساقی

نظر مشتاق ہے اپنی اک ایسے مینی والے کی
جو متھرا بن سے کاشی تک پیام یار دے ساقی

جو دیکھے اک نظر سے مسجد و بتخانہ دونوں کو
قدح نوشوں کو ایسا دیدۂ بیدار دے ساقی

نہیں درکار ایسا مرشد میخانہ رندوں کو
جو دنیا کو فریب جبہ و دستار دے ساقی

سماع و نغمہ کو اس شرط پر تسلیم کرتا ہوں
صدائے حریت مضراب کا ہر تار دے ساقی

کرے حب وطن کے ساتھ زندہ روح ملت کو
شفیق مست کو وہ طاقت ایثار دے ساقی

صبح اُمید

بال کھولے ہوئے وہ سوئے حرم آئینگے
دیکھنے میری بہارِ شب غم آئینگے

چند رندان خرابات چراغاں کے لئے
آئینگے چاند ستاروں کی قسم آئینگے

جن کی مرجھائی ہوئی شکل پہ ہنستے ہوئے ہی
چاک کرتے ہوئے دامانِ ستم آئینگے

تارے بنجائیں گے اے خاکِ وطن یاد رہے
تیرے ذرّے جو میرے زیرِ قدم آئینگے

قافلہ دور نہیں میرے سحر زادوں کا
لے کے وہ روشنیِ لوح و قلم آئینگے

شفق

کیوں فلک پر اے شفق خوں گشتہ و خونبار بن
آ زمیں پر سرخیٔ خونِ دلِ احرار بن

دامنِ ابرِ بہاری پر کہاں تک نقش و رنگ
آ شہیدوں کے بدن پر جامۂ گلنار بن

لے کے انگڑائی اُٹھیں فتح و ظفر کے رازداں
لال قلعے کے جوانوں کا دلِ بیدار بن

عکس سے جمنا کے پانی پر بنیں نقش و نگار
روضۂ ممتاز کا حسنِ در و دیوار بن

قیس کی آنکھیں لہو روتی رہینگی تا کجا
روئے لیلیٰ پر گلابی آنسوؤں کی دھار بن

جس سے تھی صدیوں زمانے میں بہارِ حریّت
آ اسی گلگونۂ محبوب کا معیار بن

:- اجنبی ادب :-

یہ مانتا ہوں شدّتِ رسمِ کہن غلط
پھر بھی وطن میں غیر وطن کا سخن غلط
پھیلائیں اپنے دیس میں کیوں اجنبی ادب
یہ بات ہے تو دعوئے حبِ وطن غلط

:- صہبائے وطن :-

ہند میں روس کی ایجاد نہیں ہے تو نہ ہو
نغمۂ غیر کی دُھن یاد نہیں ہے تو نہ ہو
میکشو کیف سے خالی نہیں صہبائے وطن
مستیٔ بادۂ الحاد نہیں ہے تو نہ ہو

:- بقائے حیات :-

تکلّفات سے ہوتی نہیں بقائے حیات
فقط ضمیر کی آواز ہے صدائے حیات
اگر سخن میں صداقت نہیں تو کچھ بھی نہیں
ادب برائے ادب ہو کہ ہو برائے حیات

مذہب

مذہب ہے فسادات مٹانے کیلئے
تہذیب کا پیغام زمانے کیلئے
ہے دیر و کلیسا و حرم کی تعمیر
انسان کو انسان بنانے کیلئے

//

غرور

جہاں نفسانیت کا قلب سے اخراج ہوتا ہے
خدا کا پاک بندہ صاحب معراج ہوتا ہے
غرور و سرکشی سے کھاتا ہے "راون" کا سر ٹھوکر
کھڑاؤں "چندر جی" کا زیب تخت و تاج ہوتا ہے

//

اطمینان

اب کوئی بسمل نہ ہوگا تیغ قاتل ہے تو ہو
خون پروانہ نہ ہوگا شمع محفل ہے تو ہو

دل کا خالق دے چکا دل جوڑنے کا بھی سبق
پھر بھی سینے میں اگر ٹوٹا ہوا دل ہے تو ہو

راہ کے کانٹے ہٹائے جا چکے ہیں راہ سے
خود امیر کارواں منزل سے غافل ہے تو ہو

جادۂ ہر موج پر ہے اہل کشتی کی نگاہ
ناخدا تیری نظر خود سوئے ساحل ہے تو ہو

سرمہ بن جاتی ہے خود آنکھوں کا خاکِ ہند بھی
چشم شاعر میں غبار نجد و محمل ہے تو ہو

ہم تو اپنی بزم کو آراستہ کرتے رہیں
آنیوالا ناشناس رسم محفل ہے تو ہو

ظلم و استبداد کے آثار مٹ جانے کو ہیں
جا چکا ہے قافلہ اب گرد منزل ہے تو ہو

درہم و برہم ہوئی جاتی ہے بزمِ قیصری
شمع محفل بجھ رہی ہے شور محفل ہے تو ہو

حرّیت کا ذوق پیدا ہو چکا ہر قلب میں
آج بھی شاہنشہی کی سعی باطل ہے تو ہو

بیکسوں کے خون سے شمع امارت جل چکی
رات کا افسانہ دہرانے کے قابل ہے تو ہو

قدرداں نغموں کے پیدا ہو چکے ہیں اے شفیق
آج بھی گلشن میں فریادِ عنادل ہے تو ہو

آج

کیا جانے گری برق شرر بار کدھر آج
کچھ مجھ کو نہیں اپنے نشیمن کی خبر آج

افلاک بھی دشمن ہیں زمیں بھی ہے مخالف
باندھی ہے زمانے نے مٹانے پہ کمر آج

کرتے تھے کبھی پرورش و تربیتِ خلق
ہوتی ہے مگر غیر کے ٹکڑوں پہ بسر آج

تحریر میں اعجاز تھا تقریر میں جادو
نالوں میں ہے تاثیر نہ آہوں میں اثر آج

تہذیب و تمدن کی ترقی ہوئی جس سے
وہ قوم بنی ہے ہدفِ فتنہ و شر آج

محدود خیالات ہیں محدود ارادے
باقی نہ رہی وسعتِ دامانِ نظر آج

دختر مزدور

اے فلک ظلم وستم اور عشوہ کاروں کیلئے ‏ — اُف جفائیں مادرِ گیتی کے پیاروں کیلئے

گردِ راہِ بیکسی ہو ماہ پاروں کیلئے ‏ — حیف بدلی میں جگہ ہو چاند تاروں کیلئے

روح فرسا ہے یہ غم الفت شعاروں کیلئے ‏ — حسن ترسے نوجوانی کی بہاروں کیلئے

آہ خارِ دشتِ غربت گلعذاروں کیلئے ‏ — کیا یہ دنیا ہے فقط سرمایہ داروں کیلئے

دوپہر کی دھوپ میں یہ منظرِ اندوہناک
سی رہی ہے ایک دوشیزہ پھٹے کپڑوں کا چاک

ایسی دوشیزہ کہ جسکو دیکھ کر صدقے ہو حور ‏ — تمکنت قرباں ہو جس پر تصدق ہو غرور

پاس جاکر میں نے پوچھا اس سے اے جانِ سرور ‏ — کیوں ہے تیری نوجوانی زیب و زینت سے نفور

تو اگر چمکے تو بن جائے جوابِ برقِ طور ‏ — نازکے دل کا سرور اے حسن کی آنکھوں کا نور

اپنے جلووں سے ہے بے پروا ترا حسنِ غیور ‏ — آنکھ آئینے سے غافل ہاتھ ہے شانے سے دور

حسن کے احساس کو اس طرح کھو جانا نہ تھا
بے نیازِ شانہ و آئینہ ہو جانا نہ تھا

چترکوٹ کی حور

سکوں نواز ہے گذری ہوئی خوشی ابتک وہ بھولتی نہیں باندے کی واپسی ابتک
وہ یاد ہے کسی جنگل کی تازگی ابتک جدھر جبین نظر ہے جھکی ہوئی ابتک

نہ بتکدہ نہ کلیسا مری نگاہ میں ہے
کہ چترکوٹ کا جلوا مری نگاہ میں ہے

جہاں سنور کے نکھرتی ہے زندگی ابتک جہاں سحر نظر آتی ہے شام بھی ابتک
جہاں رماتے ہیں دھونی رشی منی ابتک دلوں کا نور ہے سیتا کی روشنی ابتک

نثار جس پہ تقدس وہ پاک خو سیتا
وفا کا حسن شرافت کی آبرو سیتا

حیاؤ شرم کی پتلی وہ حُسن کی رانی بلند کر گئی معیار پاکدامانی
جھکی جھکی وہ نگاہیں پوتر پیشانی بلائیں لیتی ہے معصومیت کی تابانی

ادا ادا پہ جو دیکھے تو حور صدقے ہو
نظر نظر پہ بتوں کا غرور صدقے ہو

غیرتِ سلمیٰ یہ آنسو تیری چشمِ نم میں ہے ۔۔۔ یا شرابِ کوثریں، پیمانۂ شبنم میں ہے

رنگِ رخ کھویا ہوا سا فکر کے عالم میں ہے ۔۔۔ اک پریشانی کی دنیا گیسوئے پُرخم میں ہے

حسنِ مژگاں ابروئے خمدار گویا غم میں ہے ۔۔۔ جیسے بزمِ دلبری کی صف ماتم میں ہے

تجھ سی رشکِ حوریوں سر در گریباں ہم میں ہے ۔۔۔ آہ یہ کیسی قیامت جنتِ آدم میں ہے

دھوپ میں تیرے لئے اک سایۂ دیوار ہے

راستے کی گرد گویا غازۂ رخسار ہے

کر لے مجھ سے چند باتیں گو حیا پرور ہے تو ۔۔۔ کیوں پریشاں حال و غمگین و بچشمِ تر ہے تو

تیری حالت کہہ رہی ہے بیکس و مضطر ہے تو ۔۔۔ تیری صورت کہہ رہی ہے حور کی دختر ہے تو

بھر کے آہِ سرد بولی کس لئے ششدر ہے تو ۔۔۔ کیوں مری افسردگی پر مضطرب یکسر ہے تو

درد کا پتلا ہے تو اخلاص کا پیکر ہے تو ۔۔۔ سُن کہ جویائے بیانِ قلبِ نوحہ گر ہے تو

غم سے میں مانوس ہوں رنجور کی بیٹی ہوں میں

حور کی بیٹی نہیں مزدور کی بیٹی ہوں میں

اگر نقاب رُخ پر ضیا سے سرک لئے — تو ماہتاب نہیں آفتاب شرمائے
نگاہ ڈالے تو بدبیں کی روح تھرائے — پری سلام کرے حور ادب سے جھک جائے

رُخِ صبیح سے ماہ منیر شرمندہ
نظر کے تیر سے آرجن کا تیر شرمندہ

ترے نثار سن اے میرے دیس کی رادھا — کبھی تو پریت نگر کی طرف بھی جھوم کے آ
ہو تیرے حسن کے مندر میں پریم کی پوجا — کتاب رخ پہ تصدق ہو کرشن کی گیتا

ترے قدم سے مرے گھر میں بھی اُجالا ہو
غریب خانہ ترے حُسن کا شوالا ہو

عذار و زلف پہ ہر خاص و عام صدقے ہو — وفا کی صبح محبت کی شام صدقے ہو
جبین پاک پہ ماہ تمام صدقے ہو — قدم قدم پہ سجود و سلام صدقے ہو

ہر ایک شیخ و برہمن ہو دیکھ کر مسرور
تو بتکدے میں صنم ہی تو خانقاہ میں حور

ترا چراغ بجھا ہے نہ بجھنے والا ہے — نظر میں نور ہے دل میں ترا اُجالا ہے
خدا نے حسن کے سانچے میں تجھکو ڈھالا ہے — تری حیا تری عصمت کا بول بالا ہے

ترے قدم سے وطن سرفراز ہے اب تک
ترے وجود پہ بھارت کو ناز ہے اب تک

حُسنِ مظلوم

حب کرے حیف سارا آئینہ خانہ کوئی
حسن گرد آلود بے آئینہ و شانہ کوئی

جڑے گھر کی روشنی لیکن غریبانہ کوئی
ہائے جیسے چاندنی ہو اور ویرانہ کوئی

شناس کیف و مستی آنکھیں دل بھی بے سرور
پھر بھی سر سے تا قدم ناموسِ میخانہ کوئی

پنے انداز دل آرائی سے خود بھی بے خبر
پھول ہو کر پھول کی خوشبو سے بیگانہ کوئی

جیسے بوئے گل پریشاں یا گہن میں ماہتاب
آہ غربت میں با انداز جمیلانہ کوئی

جا بجا شلوار میں پیوند میلی سی قمیص
بھول بیٹھے جیسے ناز دلربایانہ کوئی

اؤں میں ٹوٹا ہوا چپل غبار آلودہ جسم
حسن کی مظلومیت کا زندہ افسانہ کوئی

نام سے تا صبح خود دامن سے آنسو پونچھنا
رات رو رو کر گزارے شمع کاشانہ کوئی

الی صورت پر بھی نازاں دخترِ سرمایہ دار
ماہرو ہو کر بھی پھرتی ہے کنیزانہ کوئی

سیٹھ جی" کا سامنا نیچی نظر حرفِ سوال
آنکھوں آنکھوں میں نگاہ ذوق مستانہ کوئی

وفِ عصمت، رنج غربت جسم فاقوں سے نڈھال
گود کے بچے کی خاطر بے حجابانہ کوئی

شک ہونٹوں پر خوشامد کا تبسم ہائے ہائے
پھر بھی فرطِ شرم سے تصویرِ بت خانہ کوئی

اے خداوندانِ دولت عرش حق ہل جائیگا
گر پکار اُٹھا خدا کو دردمندانہ کوئی

حسنِ بیمار

انجمن رات کی خاموش ہوئی جاتی ہے
چاندنی ماہ کی رُوپوش ہوئی جاتی ہے
زندگی مرگ در آغوش ہوئی جاتی ہے
میری محفل تری جاتی ہوئی دُنیا ہے تو آ

منتشر زلف یہ تاب ہوئی جاتی ہے
تازگی حسن کی بے آب ہوئی جاتی ہے
چاند تاروں کی فضا خواب ہوئی جاتی ہے
تجھے اس منزل عبرت سے گزرنا ہے تو آ

بے سکوں ہے دلِ بیمار تو آنکھیں بے خواب
شب تاریک ہے طوفان ہے خوف گرداب
بادباں ٹوٹ گیا آنکھ دکھاتے ہیں حباب
میری کشتی تری غیرت کا سفینا ہے تو آ

رات کا وقت ہے تاریکی و تنہائی ہے
یاس و نومیدی و حرماں کی گھٹا چھائی ہے
امتحانات محبت کی گھڑی آئی ہے
کار امروز باندیشۂ فردا ہے تو آ

شوق جاتا ہے جو خلوت گہ ارماں کی طرف
ہاتھ بڑھتا ہے ترے گوشۂ داماں کی طرف
اک نظر دیکھ لے تقدیر کے گلستاں کی طرف
اس میں میری ہی نسیم چمن آرا ہے تو آ

محفل شوق کو آراستہ کرنے والے
رنگ احساس کی تصویر میں بھرنے والے
آج بھی عشق کی راہوں سے گزرنے والے
ہمرہِ قافلہ گردِ سگِ لیلا ہے تو آ

جسم بیکل ہے جگہ اپنی بدلنے کیلئے — روح بیچین ہے اس بزم سے چلنے کیلئے
نغمہ بیتاب ہے تاروں سے نکلنے کیلئے ..... یہ نظارا تری آنکھوں کو گوارا ہے تو آ

آ کہ بالیں پہ طبیبوں کو بلاؤں کیونکر — تو نہیں ہے تو انھیں نبض دکھاؤں کیونکر
آہ اغیار کو آواز سناؤں کیونکر ..... تو مرے حسن کے ناموس کا پردا ہے تو آ

آ کہ اے میری محبت کے چمن کے مالی — ناروا ہے مرے پھولوں کے لئے پامالی
"میرے یوسف" تجھے خط لکھ کے بلانیوالی ..... تیری ہی قصرِ جوانی کی زلیخا ہے تو آ

ہاں تجھے اپنی وفا یاد دلاتی ہوں میں — آخری مرتبہ خط لکھ کے بلاتی ہوں میں
اک نئے شہر نئے دیس کو جاتی ہوں میں ..... اب نہ آؤنگی جو ملنے کی تمنّا ہے تو آ

کشتیِ شوق پہ آ، دوری ساحل ہے تو کیا — ناقے چلتے ہیں غبارِ رہِ منزل ہے تو کیا
جا بجا خارِ الم راہ میں حائل ہے تو کیا ..... انھیں کانٹوں میں بہارِ گلِ رعنا ہے تو آ

میرے ہونٹوں پہ تبسم کی جھلک ہو کہ نہ ہو — میرے رخساروں میں پہلی سی چمک ہو کہ نہ ہو
زلف خمدار میں اگلی سی مہک ہو کہ نہ ہو ..... حسن بیمار اگر تیرا مسیحا ہے تو آ

ٹوٹی ہوئی کشتی

نکلی تھی شب کی دیوی تاروں کی روشنی میں
سرتا قدم معطر خوشبوئے دلکشی میں

اک دھیمی دھیمی لے تھی جنبیدہ خامشی میں
جیسے سکوت لہریں لیتا ہو نغمگی میں

سنجیدگی سی طاری ہر پھول ہر کلی میں
یا حسن کا تبسم خواب شگفتگی میں

خاموشیوں میں رقصاں اس قسم کا ترنم
گویا حیا کی رانی گاتی ہو بانسری میں

وہ روئے گل کی لالی وہ رات کی اجالی
گلشن کی ڈالی ڈالی ڈوبی ہوئی خوشی میں

وہ برگ گل پہ شبنم وہ پنکھڑی کا عالم
جیسے کوئی حسینہ منہ دیکھے آرسی میں

بس برف سے ڈھلی تھی ساری فضائے ہستی
چاندی پگھل رہی تھی شفاف چاندنی میں

تھیں چاند کی شعاعیں موج بہار گویا
کشمیر کی فضا میں اک آبشار گویا

فطرت سنا رہی تھی کوئی ستار گویا
کرنوں میں گندھ رہا تھا شبنم کا ہار گویا

قربان کر رہی تھیں حوریں شباب اپنا
جنت لٹا رہی تھی اپنا نکھار گویا

شاخوں کی گلفشانی وہ کیاریوں میں پانی
اٹھتی جوانیوں کا آئینہ دار گویا

غنچوں کی ہر چٹک میں پیغام زندگی تھا
بیدار ہو رہا تھا ہر شاہکار گویا

وہ منظرِ گلستاں جس پر نگاہ قرباں
دار السلام جیسے دار القرار گویا

سرو و چنار باہم یوں جھومتے تھے باہم
رقصیدہ ہر قدم پر کوئی نگار گویا

اس منظرِ حسیں میں وہ بحر کا کنارا
کہسار سے گزر کر دریا کا سین پیارا

سیڑھی پہ گھاٹ کی وہ حسن آفریں نظارا
اک گنگنانے والی ساحل کی ماہ پارا

تارے فلک سے ٹوٹے ماہِ مبیں پکارا
"دل میرود زدستم صاحبدلاں خدارا"

اک سمت اس فضا میں اک درد دل کا مارا
حرماں کی شمع محفل غم کی نظر کا تارا

سہمی ہوئی نگاہیں دریا کا تیز دھارا
ٹوٹی ہوئی سی کشتی امیدوں کا سہارا

احساس کا تقاضا جذبات کا اشارا
دیکھا جو سوئے ساحل اکبار نعرہ مارا

کشتی شکستگانیم اے باد شرطہ برخیز
باشد کہ باز بینم آں یار آشنارا

رقاصہ

رخصت اے ہوش کہ رقاصۂ محشر آئی
مغربی روپ میں مشرق کی فسوں گر آئی

تمکنت سے حد تہذیب کے اندر آئی
کم سے کم پھر بھی قیامت کے برابر آئی

"رنگ گھر" میں جو وہ "اسکیٹ" پہن کر آئی
حور گویا حرم ناز کے اندر آئی

چرچ میں جیسے کوئی ماہ جمال انگلینڈ
یا پری تخت پہ آئی ہے بجاتی ہوئی بینڈ

حسن دوشیزہ ہے شوخی کے سہارے رقصاں
رقص کے ساتھ نگاہوں کے نظارے رقصاں

جیسے کشمیر کی نہروں میں شکارے رقصاں
تخت بلقیس کی پرواز میں تارے رقصاں

اسی ماحول میں ارمان ہمارے رقصاں
دل کی ہر آہ کے ہمراہ شرارے رقصاں

کوئے عشق است بناموس سلام است اینجا
صد چو محمود بہر گوشہ غلام است اینجا

مشرقی حور مگر شاہد مغرب کی ادا
توڑ دے پیر کلیسا کی عنان تقویٰ

آنکھ کے گرد کچھ اس حسن سے کاجل پھیلا
جسطرح پھول کا رس چوس رہا ہو بھونرا

لب جاں بخش و زنخداں کا وہ عالم گویا
ساحل چشمۂ حیواں پہ مسیحا کی بقا

اک سہیلی سے چلی مل کے جو وہ رشک قمر
ہاتھ سے ہاتھ ملا شکل ہلالی بنکر

یہ نزاکت یہ لچکنے میں کمر کا عالم
یہ پھسلنے میں بُت شعبدہ گر کا عالم

پھر سنبھلنے میں حریفانہ ہنر کا عالم
پائے لغزیدہ سے اک حسن دگر کا عالم

اُف تبسم کی ادا شوخ نظر کا عالم
صبح کا پھول مگر برق و شرر کا عالم

زلف مشکیں رُخ گلرنگ پہ بل کھائی ہوئی
جس طرح نکہت گُل بجنبہ پھیلائی ہوئی

رقص کرتی ہوئی جس سمت گزر جاتی ہے
فتنۂ حشر کو ہر گام پہ ٹھکراتی ہے

دور تک جاکے جو مڑتی ہوئی کتراتی ہے
نگہ شوق پکار اُٹھتی ہے وہ آتی ہے

ڈانس کرتی ہوئی اس طرح وہ لہراتی ہے
جیسے اڑتی ہوئی تتلی سی چلی آتی ہے

ہائے پہلو میں بحسرت دل ناکام کا شور
آمری خاک کے ذرّوں سے بنے تیرا "فلور"

نرگسیں آنکھوں سے دیتی ہوئی مستی کا پیام
شیشہ در شیشہ و پیمانہ بہ پیمانہ تمام

جانے کیا ہوگا تماشائے نظر کا انجام
زہر بھی بول اُٹھا آج نہ پینا ہے حرام

جیسے میخانہ در آغوش کوئی مست خرام
ہمہ صہبا ہمہ ساغر ہمہ بادہ ہمہ جام

کہہ رہا ہے بہ تمنا دل صاحب نظراں
کہ جفا ہائے تو خوشتر ز وفائے دگراں

مہر عارض کی کرن بالوں میں اُلجھائی ہوئی
چاندنی پردۂ ظلمات میں گھبرائی ہوئی

شوخیٔ حسن ز سر تا بقدم چھائی ہوئی
شورش فتنۂ تاتار بھی تھرائی ہوئی

تمکنت چہرے پہ ماتھے پہ شکن آئی ہوئی
اک قیامت قدم ناز کی ٹھکرائی ہوئی

چہ بتے جان خرابات نظر می آید
کہ بہ نور و نہ بزاری نہ بزر می آید

وداعِ عروس

لکھا تھا آہ اس گھر سے جدا ہونا مقدر میں — جہاں پیدا ہوئی پلکر بڑھی آغوش مادر میں
تصور بھی نہ تھا بچپن کے عہد عیش پرور میں — کہ یوں جلنا پڑیگا ایک گھر سے دوسرے گھر میں
مرا گھر کم نہ تھا میرے لئے ایوانِ جنت سے
در و دیوار کو تکتی ہوئی جاتی ہوں حسرت سے

اسی گھر میں تو مٹی کے گھروندے میں بناتی تھی — یہیں شام و سحر طاقوں کو گڑیوں سے سجاتی تھی
یہیں میں بیٹھ کر ہمجولیوں میں گیت گاتی تھی — یہ گھر فردوس بنجاتا تھا جب میں مسکراتی تھی
لڑکپن کی تمنائیں اسی مٹی میں سوئی ہیں
یہاں طفلی کی خوش آیند راتیں ہم نے کھوئی ہیں

جو یاد آتا ہے عہدِ رفتہ آہ سرد بھرتی ہوں
بڑی حسرت سے بچپن کا زمانہ یاد کرتی ہوں

گلا ہے آسماں سے بخت پر الزام دھرتی ہوں
امید و بیم کی پیچیدہ منزل سے گزرتی ہوں

بدلتا ہے سماں میرا بدلتی ہے فضا میری
وہ گھر چھٹتا ہے جس گھر میں ہوئی نشو و نما میری

عجب رکھا ہے فطرت نے طریق انتخاب اپنا
معما سا نظر آتا ہے ہم کو انقلاب اپنا

کہ طفلی میں تو گزرا گھر میں عہدِ لاجواب اپنا
چھٹا کاشانۂ دیرینہ جب آیا شباب اپنا

نئی محفل میں جانا ہے نئی منزل میں رہنا ہے
کسی کی آنکھ میں بسنا کسی کے دل میں رہنا ہے

لوری

میں تجھ کو صاحب فوج و نشاں بناؤنگی — کہ اپنا دودھ پلا کر جواں بناؤں گی
صبا جھلائے گی تجھ کو خوشی کے جھولے میں — ترے لئے چمن بے خزاں بناؤں گی
نظامِ گردشِ دوراں جو سونپ دے تجھ کو — میں تیرے واسطے وہ آسماں بناؤں گی
عروسِ خاک کے گیسو سنوارنے کے لئے — زمیں پہ تیرے لئے کہکشاں بناؤں گی
جھکاؤنگی ترے قدموں پہ ماہ و انجم کو — میں تجھ کو ثانیٔ صاحب قراں بناؤں گی
تجھے عدالت و انصاف کا سبق دونگی — کہ اپنے وقت کا نوشیرواں بناؤں گی
بتاؤنگی تجھے راز نظامِ جمہوری — کہ تجھ کو رہبرِ ہندوستاں بناؤں گی

بنا کے تیرے لئے تاج و تخت و چتر و علم
رئیسِ بارگہ و کارواں بناؤنگی

بیوہ کی شادی

سوغم و رنج اور اک ہستی فانی یارب
زخم دل، داغ جگر، سوز نہانی یارب
سرد آہیں تو کبھی اشک فشانی یارب
کیا اسی واسطے آئی تھی جوانی یارب

چھیڑ کر باد بہاری نہ رُلائے مجھ کو
مطربہ گیت خوشی کے نہ سنائے مجھ کو

زندگی کا نظر آتا نہیں اب کوئی مآل
کوئی مقصد نہیں جینے کا جُدائی نہ وصال
چھیڑتا ہے کوئی اب مجھکو تو ہوتا ہے ملال
کیا کہوں تجھ سے سکھی بیتے ہوئے وقت کا حال

شبِ تاریک بھی کاکل کا سبق ہوتی تھی
چاندنی رات بھی چاندی کا ورق ہوتی تھی

یاد گزری ہوئی راتوں کی جو آجاتی ہے
ضبط کرتی ہوں مگر آہ نکل جاتی ہے
جب خوشی کا کوئی پیغام سحر لاتی ہے
میرے کانوں میں کچھ آواز سی آجاتی ہے

جیسے روتا ہو مرا کشتۂ آزار کوئی
اور کہتا ہے بہ حسرت پسِ دیوار کوئی

ں مری جان محبت کا سبق بھول گیا — چھپ کے روتی تھیں وہ دیرینہ قلق بھول گیا

رے اخلاص مرے پیار کا حق بھول گیا — چاندنی آئی تو پھر خون شفق بھول گیا

اُن کے گھر میں پئے جاروب کشی رہنے دے

میں جہاں ہوں وہیں تقدیر پڑی رہنے دے

وں صبا میرے لئے نکہت گل لاتی ہے — کیوں مرے گھر میں نسیم سحری گاتی ہے

وں مسرت دل مایوس کو بہلاتی ہے — بے بلائے ہوئے کیوں گھر میں خوشی آتی ہے

ایک اترے ہوئے چہرے کا نکھرنا کیسا

اب مری زلف پریشاں کا سنورنا کیسا

کوئی کہدے مرے احباب مرا غم نہ کریں — اب مرے زخم کو منت کشِ مرہم نہ کریں

فکر آشفتگیِ گیسوئے پُرخم نہ کریں — اک وفادار کو رسوائے دو عالم نہ کریں

بیوگی میں بھی بسر انکی دعا سے ہوگی

رائیگاں ہوگی جوانی تو بلا سے ہوگی

جا مجھے چھیڑ نہ بادِ سحری رہنے دے — تازہ ہوجائے گا زخم جگری رہنے دے

گوشۂ یاس میں آشفتہ سری رہنے دے — شرم ہے میرے لئے دربدری رہنے دے

لوگ اب دوسرے حلقے میں نہ الجھائیں مجھ کو

چوڑیاں ٹوٹ چکی ہیں تو نہ پہنائیں مجھ کو

ناخدا بھی نہیں دریا کا کنارا بھی نہیں ایسی ڈوبی ہوں کہ موجوں نے اُبھارا بھی نہیں

یوں وہ روٹھے ہیں کہ چلمن سے نظارا بھی نہیں یوں ڈبویا ہے کہ تنکے کا سہارا بھی نہیں

وہ نہیں ہیں تو مرے حسن کا جادو بھی نہ رہو

باغ میں پھول نہ ہو پھول میں خوشبو بھی نہ ہو

شمع سے شکوہ کناں غیرت پروانہ ہے آج محفل عشق کا عالم ہی جداگانہ ہے آج

جیسے عصمت مری کچھ غیر شریفانہ ہے آج حسن شاہانہ ہے انداز کنیزانہ ہے آج

رنگ پھیکا ہے محبت کی پرستاری کا

چہرہ اترا نظر آتا ہے وفاداری کا

ہاں اسے بیٹھ کے سوچیں تو ذرا دل والے جلوے رسوا کیے جاتے نہیں محمل والے

کیوں دلہن مجھ کو بنائیں نئی محفل والے کیا کہیں گے مری اجڑی ہوئی منزل والے

گلشن نو سے یہ زندان محن بہتر ہے

چادر جشن عروسی سے کفن بہتر ہے

غم سے مایوس ہو جو دل وہ خوشی کیا جانے حسن شاداب کو افسردہ کلی کیا جانے

مرنے والے تو مری جاں بلبی کیا جانے جو مرے دل پہ گزرتی ہے کوئی کیا جانے

کیوں نہ جانا مجھے قسمت نے امانت تیری

طعنہ دیتی ہے وفادار محبت تیری

عقد ثانی کے تصور سے بھی گھبراتی ہوں
اے فلک اپنی جوانی کی قسم کھاتی ہوں
مرنے والے کے تصور میں مزا پاتی ہوں
سرحدِ فکر دو عالم سے گزر جاتی ہوں
گوشۂ غم میں پڑی ہوں تو پڑی رہنے دیں
یوں ہی رخساروں پہ اشکوں کی لڑی رہنے دیں

میرے گلزار کے پھولوں نے مہکنا چھوڑا
میری امید کے پودوں نے لہکنا چھوڑا
شاخ پر صبح کی چڑیوں نے چہکنا چھوڑا
جب سے تو نے مرے خورشید چمکنا چھوڑا
کون ہمدرد ہے کس سے کہوں افسانۂ غم
غمگسارے نہ رفیقے نہ انیسے دارم

کتنا بے کیف مزاج دل دیوانہ ہے آج
آہ گزری ہوئی برسات کا افسانہ ہے آج
نہ وہ منزل ہے ہماری نہ وہ کاشانہ ہے آج
ہم سے رنجیدہ ہوائے درِ جانانہ ہے آج
بوئے عشرت کدۂ دوست نہیں آتی ہے
اور آتی ہے تو کترا کے نکل جاتی ہے

فصل گل آتے ہی چھوٹا ہے نشیمن مجھ سے
کھینچ کے چلتی ہے شمیم در گلشن مجھ سے
آج منہ پھیر کے یاد رخ روشن مجھ سے
کر گئی شکوۂ کوتاہیِ دامن مجھ سے
کرتی ہے کس کے حوالے مری تقدیر مجھے
کیوں بہار آئی ہے پہنانے کو زنجیر مجھے

کاش تیری ہی بہاروں کا چمن ہوتی میں
تیرے ہی مہرِ محبت کی کرن ہوتی میں

یا ہمیشہ تری خلوت کی پھبن ہوتی میں
یا شبِ گور میں بھی صبحِ وطن ہوتی میں

حسن خلوت کدۂ ناز میں تنہا کیوں ہو
اُٹھ گیا قیس زمانے سے تو لیلا کیوں ہو

آہ تو اور بھلا دینے کے قابل ہو جائے
نام لینا بھی ترا شرم سے مشکل ہو جائے

کیوں نہ اُجڑی ہوئی بستی مری منزل ہو جائے
ہو کے آباد جو بے ناقہ و محمل ہو جائے

بھولتا ہی نہیں وہ روئے دل آرا تیرا
شام کو صبح بناتا تھا نظارا تیرا

تجھ سے آباد تمنّاؤں کی منزل نہ رہی
دن کا جلسہ نہ رہا رات کی محفل نہ رہی

میں تری بارگہِ عشق کے قابل نہ رہی
کہ وہ لیلیٰ ہوں جو شائستۂ محمل نہ رہی

غیر ہے تیری جگہ میری طلبگاری کو
ٹھیس لگتی ہے مرے حسن کی خودداری کو

میری بےعزتی نے کب اس رشتے کو منظور کیا
ماں نے اصرار کیا باپ نے مجبور کیا

خوب قسمت نے علاجِ دلِ مہجور کیا
میرے پیارے ترے گھر سے بھی مجھے دور کیا

غیر کی بانوئے کاشانہ کہی جاؤنگی
آج سے میں تری بیوا نہ کہی جاؤنگی

آج شرمندہ ہوا نازِ خود آرائی بھی　　آج مجروح ہوئی حسن کی یکتائی بھی
حیف تقدیر میں لکھی تھی یہ رسوائی بھی　　پاکدامن ہوں اور اک ستم کی ہرجائی بھی

تیری کہلا کے کسی اور کی کہلاؤں میں
کاش پھٹ جائے زمیں اور سما جاؤں میں

بیوہ کی شادی کا جواب

حسن کو حسن کے نقاد سے روپوش نہ کر
جسمیں نغمات ہیں اس ساز کو خاموش نہ کر
سوگواری کو عروسی سے ہم آغوش نہ کر
کچھ جوانی کا بھی حق ہے تو فراموش نہ کر

دل دکھے جس سے اس افسانے کو تو یاد نہ کر
ہوں تری زلف کا قیدی مجھے آزاد نہ کر
روح خوشیوں کیلئے ہے لسے ناشاد نہ کر
حسن قدرت کا عطیہ ہے تو برباد نہ کر

آہ احساس کی بنیاد وفا ہلتی ہے
اسے توڑا نہیں جاتا جو کلی کھلتی ہے
چاک ہو کر کہیں پھولوں کی قبا سلتی ہے
پھر جوانی کسی قیمت پہ نہیں ملتی ہے

جلوہ آوارہ نگاہوں کا تماشا بھی نہ ہو
نوجوانی کا تقاضا ہے کہ تنہا بھی نہ ہو
شمع کو چاہیئے پروانے سے پردا بھی نہ ہو
حسن رسوا بھی نہ ہو اور اکیلا بھی نہ ہو

شان عصمت سے بدلتا ہے جو کاشانہ کبھی — نہیں مٹتا شرف جلوۂ جانانہ کبھی
حسن معصوم نہیں غیر شریفانہ کبھی — ہو گی دھندلی نہ تری سرخیٔ افسانہ کبھی

عقد ثانی میں کب اندیشۂ رسوائی ہے — اپنی ہی شان پہ قائم تری یکتائی ہے
دین فطرت میں وہ اعجاز مسیحائی ہے — چمن اجڑا ہے تو پھر باد بہار آئی ہے

تیرے جذبات سے میں برسرپیکار نہیں — تیرے احساس وفا سے مجھے انکار نہیں
پر مجھے غیر سمجھنا تو سزاوار نہیں — ہوں نگہبان چمن برق شرر بار نہیں

میں نہ جذبات کو ہوں ٹھیس لگانے والا — نہ تری شمع کو پھونکوں سے بجھانے والا
میں تو ہوں حسن کو خطروں سے بچانے والا — پھول کی راہ سے کانٹوں کو ہٹانے والا

کیوں ترے قلب میں احساس کنیزانہ رہے — حسن شاہانہ ہے انداز بھی شاہانہ رہے
فصل گل آئے تو دور مئے و پیمانہ رہے — رشک فردوس حریم در جانانہ رہے

سن مری بات ذرا غور سے اے نیک نصیب
حسن تنہا کو ہے اندیشۂ اغیار و رقیب
یوں رہے بچ کے کہ دھندلی نہ ہو تصویر حبیب
پھرتے ہیں سیکڑوں بھونرے گل خنداں کے قریب

شاد رہ سکتی ہے تنہائی میں عورت کب تک
ہونگے احباب شریک غم و راحت کب تک
غربت و یاس میں خودداری و غیرت کب تک
جس کا مالی نہ ہو اس گل کی حفاظت کب تک

نگراں چاہیئے جلوے کی درخشانی کو
شانہ درکار ہے گیسو کی پریشانی کو
زنگ کا خوف ہے آئینے کی تابانی کو
جوہری چاہیئے موتی کی نگہبانی کو

دولت حسن کو وابستۂ محرم کرنا
شانہ کو جلوہ دہ گیسوئے پرخم کرنا
عصمت ناز کی بنیاد کو محکم کرنا
اسے کہتے نہیں رسوائے دو عالم کرنا

کر نہ رسوا مرے اخلاص طلبگاری کو
میں ہوں تیری ہی بھلائی کی نگہداری کو
خلوت خاص میں تزئین ادا کاری کو
کوئی ہمراز بھی ہو آئینہ برداری کو

جانِ صد نغمہ ہو تم پیکرِ ماتم نہ بنو
کہ بہارِ گلِ خنداں ہو تو شبنم نہ بنو
ہو کے تصویرِ طرب حزنِ مجسم نہ بنو
چاندنی ہو کے شبِ تار کا عالم نہ بنو

اُف یہ ساون کی جھڑی شورشِ جذبات کی رات
بوندیاں، سرد ہوا، وصل و ملاقات کی رات
حسرت انگیز ہے تنہائی میں برسات کی رات
نوجواں پردہ نشیں کیلئے خطرات کی رات

جس شریعت نے دیا تھا کبھی عشرت کا پیام
پھر اسی نے تمھیں بھیجا ہے مسرت کا پیام
صبح لائی ہے تمھارے لئے راحت کا پیام
قید کی شکل میں آزادی عصمت کا پیام

لے کے آیا ہوں تو پھیر نہ مری سوغاتیں
آؤ اب مجھ سے کرو مہر و وفا کی باتیں
پھر وہی پیار کے جھگڑے ہوں وہی برساتیں
دن جہانگیر کے ہوں نورجہاں کی راتیں

لڑکی کا خط اماں کے نام

سلام اور آداب کے بعد اماں، گزارش ہے لونڈی کی با چشمِ گریاں
کہ زندہ ہوں لیکن گرفتار حرماں باہ غریباں با شک یتیماں

مجھے بھول جاؤ مری پیاری اماں

طبیعت ہے ناواقف دردِ حرماں رمیدہ رمیدہ پریشاں پریشاں
نہ جینے کی خواہش نہ مرنے کا ارماں نہ صبح وطن ہے نہ شام غریباں

مجھے بھول جاؤ مری پیاری اماں

لکھوں کیا پریشانیوں کا فسانہ نہ آنکھوں میں سرمہ نہ بالوں میں شانہ
نظر سائلانہ قدم عاجزانہ کسی کو نہ یہ دن دکھائے زمانہ

مجھے بھول جاؤ مری پیاری اماں

جلاتے ہیں دن رات سسرال والے پڑے ہیں مجھے اپنے جینے کے لالے
ستاتا ہے مجھ کو زمانہ ستالے مری بیگناہی خدا کے حوالے

مجھے بھول جاؤ مری پیاری اماں

وہ میری ہر اک بات پہ نکتہ چیں ہیں ‏ ‏ ‏ خفا ہیں کشیدہ ہیں چیں بر جبیں ہیں

یہ ہر حال جب دیکھئے خشمگیں ہیں ‏ ‏ ‏ یہ معلوم ہوتا ہے شوہر نہیں ہیں

مجھے بھول جاؤ مری پیاری اماں

میں کس طرح آؤں اجازت نہیں ہے ‏ ‏ ‏ چلی آؤں بے پوچھے ہمت نہیں ہے

کہے گا زمانہ کہ غیرت نہیں ہے ‏ ‏ ‏ نہ ہو شرم و غیرت تو عورت نہیں ہے

مجھے بھول جاؤ مری پیاری اماں

قطعات

مولانا ابوالکلام آزاد

سبو و خم بھی ہے ساقی بھی دور جام بھی ہے
شریک بزم مرا سوز ناتمام بھی ہے
ادیب بھی ہیں سخنور بھی ہیں زباں داں بھی
مجھے بتاؤ کہ کوئی ابوالکلام بھی ہے

اُردو ہندی

ہندی بھی ہماری ہے اُردو بھی ہماری ہے
یہ بھی ہمیں پیاری ہے وہ بھی ہمیں پیاری ہے
اک خالدہ خانم ہے اک راجکماری ہے
اک ہاتھ میں شانہ ہے اک ہاتھ میں آئینہ

انسانیت

فضاؤں میں پرواز کا فن سکھایا
تو دریا کی موجوں کو ساحل بنایا
سمندر کی تہ میں بھی راہیں نکالیں
مگر آدمی بن کے چلنا نہ آیا

ہولی

یار نا آشنا نہیں ملتا　　　دل سے دل برملا نہیں ملتا
کیا کہیں ہم بھی کھیلتے ہولی　　　ہم کو رنگ وفا نہیں ملتا

خودی

بیچارگی و مظلومی کی ذلّت کو دوامی کون کرے
احساس خودی بیدار ہے اب در در کی سلامی کون کرے
فرعون کا استکبار کجا اب روس میں دور زار کجا
خالق ہی کا سجدہ مشکل ہے بندوں کی غلامی کون کرے

شکایت

مرحمت چھپا کر مجھے نظروں سے گرانے والے
جا کے پردیس مجھے دل سے بھلانے والے
صبح سے پہلے مری شمع بجھانے والے
میری معصوم جوانی کو ستانے والے

چاک ہے قلب و جگر حسن گریباں کی قسم
میں ہوں یا رات کے آنسو ترے داماں کی قسم
صبح بے نور ہے تیرے رخِ تاباں کی قسم
شام اندھیری ہے ترے گیسوئے پیچاں کی قسم

جاتے ہی تو نے مجھے دل سے فراموش کیا
کچھ بھی اندیشۂ فردا نہ غمِ دوش کیا
مجھکو تیرے غمِ فرقت نے سیہ پوش کیا
تو نے اک فلم کی دیوی کو ہم آغوش کیا

فلم مرکز ہے تعیش کے پرستاروں کا
حسن معشوق جہاں مال ہے بازاروں کا
شوق بیباک ہے مجمع ہے اداکاروں کا
ایک بازار ہے عصمت کے خریداروں کا

دشمنِ ہوش ہیں ان شعبدہ کاروں کو نہ دیکھ
منظرِ عام پہ حوروں کی قطاروں کو نہ دیکھ
ہیں یہ سونگھے ہوئے پھول انکی بہاروں کو نہ دیکھ
روشنی ختم ہے ٹوٹے ہوئے تاروں کو نہ دیکھ

تیرے پہلو میں بھی ہیں پہلوئے اغیار میں بھی
تیری خلوت میں بھی ہیں محفل و بازار میں بھی
دلِ عاشق میں بھی ہیں چشمِ ہوس کار میں بھی
چاندنی میں انھیں راحت ہے شبِ تار میں بھی

تا کجا فلم کی پریوں کا ترانہ تا چند
رات بھر گرمیٔ محفل کا فسانہ تا چند
آہ یہ زندگیٔ بوالہوسانہ تا چند
جانے والا ہے جوانی کا زمانہ تا چند

نہ تجھے اپنے بزرگوں کی وجاہت کا خیال
نہ گھرانے کی روایات شرافت کا خیال
تجھے اخلاق کا احساس نہ سیرت کا خیال
نہ وفاداریٔ محبوبۂ خلوت کا خیال

ہو گی تاریک محبت کی فضا میرے بعد
ناز ہو جائے گا مایوسِ وفا میرے بعد
نہ ملے گا تجھے چاہت کا مزا میرے بعد
ختم ہو جائے گی راتوں کی دعا میرے بعد

جب نہ ہو گی مری خوشبوئے وفا میرے بعد
کیا کہے گی ترے گلشن کی فضا میرے بعد
پھر کہاں گرمیٔ ہجراں کا گلا میرے بعد
آ کے رلوائیگی دامن کی ہوا میرے بعد

جانباز لڑکی

مری نظروں میں تھا رات اک شہادت گاہ کا عالم
جہاں موتی لٹاتی تھی کسی کی نعش پر شبنم
شہیدوں کے جلو میں خاک پر اک ثانیٔ مریمؑ
بہر سو رقص بسمل بود شب جائیکہ من بودم

وہ اک گزرا ہوا درد آفریں منظر نگاہوں میں
وہ خوں آلودہ اک پیشانیٔ انور نگاہوں میں
جہادِ حسن ہے عنوانِ صد محشر نگاہوں میں
کہ پھرتی ہے کوئی خونیں کفن دختر نگاہوں میں

عجب رنگ شہادت آشکارا دیکھتا ہوں میں
لہو کو غازۂ روئے دل آرا دیکھتا ہوں میں
رخِ رنگیں کو زخموں کا سنوارا دیکھتا ہوں میں
شفق کی گود میں روشن ستارا دیکھتا ہوں میں

سرِ میداں ہے اک نازوں کی پالی دیکھتا ہوں میں
بشکلِ تیغِ ابروئے ہلالی دیکھتا ہوں میں
ذرا سا قد مگر ہمت ہے عالی دیکھتا ہوں میں
کہ جگنو ہے مگر سوزِ بلالی دیکھتا ہوں میں

یہی معلوم ہوتا ہے کہ با طرزِ دل آرائی
شعاعوں کے سہارے چرخ سے ناہید اُتر آئی
حیا کی گود میں معصومیت لیتی ہے انگڑائی
لبوں پر مسکراتی ہے مسیحا کی مسیحائی

بڑھے جاتے ہیں جانبازانِ ملّت شوق کے مارے
زمیں کو روندتے جاتے ہیں کانٹے ہوں کہ انگارے
جدا کرتی ہیں مائیں گود سے اپنے جگر پارے
دلہن شوہر کو رخصت کر رہی ہے جا مرے پیارے

بہادر غازیوں کا جسم زخموں سے گلستاں ہے
زمیں کا ذرّہ ذرّہ پیکرِ خونِ شہیداں ہے
کفن بردوش اک محبوبۂ ملّت خراماں ہے
کہ تتلی جنّت الفردوس کے پھولوں پہ رقصاں ہے

ہوائے تُندبن غازی سے موجیں لے کے آتی ہے
انھیں موجوں میں علمائے شہادت گیت گاتی ہے
وہ مشکیزہ لئے باغِ جناں کی حور آتی ہے
وہ دیکھو زخمیوں کو فاطمہ پانی پلاتی ہے

تڑپتے سے کسی زخمی پہ گرنے کو بڑھی سایا
کسی پیاسے کے ہونٹوں سے لگایا بڑھ کے مشکیزہ
کبھی گاتی ہے بالیں پر شہیدوں کی وہ یہ نغمہ
خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

قمیض پاک سے لپٹی ہوئی گردِ بیاباں ہے
حیں نازک پاؤں میں چھالے غبار آلودہ داماں ہے
ڈوپٹے پر ہیں دھبے خون کے، گیسو پریشاں ہے
مگر معصوم چہرہ آفتابِ نورِ ایماں ہے

فضا سے آگ برسانے لگے اٹلی کے طیارے
زمین لالہ گوں سے چھوٹتے ہیں سرخ فوارے
بدن سے فاطمہؓ کے بہہ رہے تھے خون کے دھارے
نگاہیں کر رہی ہیں جنتِ کبریٰ کے نظارے

لباس و جسم پر جو خون کا قطرہ ہے موتی ہے
جوانی صدقے ہے دوشیزگی قربان ہوتی ہے
ابھی پانی پلاتی تھی ابھی لاشوں میں سوتی ہے
شہادت آنسوؤں سے حُسن کا دامن بھگوتی ہے

رضائے حق کے احساسات بہرِ دلنوازی ہیں
کہ توپوں کی گرج ہے اور سجدوں میں نمازی ہیں
جہاد و حرّیت کے جوش میں ترکان غازی ہیں
گریباں جن کے تاتاری مگر تکمے حجازی ہیں

اُٹھ آنکھیں کھول اے پیمانہ دارِ کوثر و زمزم
کہ حلقے میں لئے ہیں تجھکو سب ترک و عرب باہم
تری ساقی گری کی دھوم، معصومی کا وہ عالم
ہنوزم آرزو دارم کہ یک بار دیگر بینم

بیوہ کے آنسو

محبت کے گل و گلزار تم کو یاد کرتے ہیں
مرے داغِ دلِ بیمار تم کو یاد کرتے ہیں

تمہیں فردوس کے پھولوں میں یہ محسوس کرنا تھا
کہ مرجھائے ہوئے رخسار تم کو یاد کرتے ہیں

تمہیں طوبیٰ کے سائے میں مزے کی نیند آتی ہے
ہمارے دیدۂ بیدار تم کو یاد کرتے ہیں

ستاروں کی ضیا پاشی میں شبنم کی تراوش میں
ہمارے اشک گوہربار تم کو یاد کرتے ہیں

جنھیں تم پیار میں اکثر پہنا دیتے تھے ہاتھوں سے
وہ کانوں کے دُرِ شہوار تم کو یاد کرتے ہیں

نہ دیکھی جاتی تھی تم سے کبھی جن کی پریشانی
وہ میرے گیسوئے خمدار تم کو یاد کرتے ہیں

بہار خوش خرامی ایک مدت سے نہیں دیکھی
تمہارے کوچہ و بازار تم کو یاد کرتے ہیں

تم اپنی جلوہ پیمائی سے رونق جن کو دیتے تھے
وہ میلے اور وہ تہوار تم کو یاد کرتے ہیں

کب اس پردہ نشیں کے آنسوؤں کو لوگے دامن میں
کہ جس کے زخم دامندار تم کو یاد کرتے ہیں

خوشا وقتیکہ میں چلمن میں سوتی اور تم کہتے
اُٹھو کب سے پسِ دیوار تم کو یاد کرتے ہیں

تمہارے ہجر میں بھاتا نہیں زیبِ گلو ہونا
ہمارے موتیوں کے ہار تم کو یاد کرتے ہیں

جنھیں تم گود میں لیکر شفقت پیار کرتے تھے
وہ بچے نیند میں ہر بار تم کو یاد کرتے ہیں

خوشی سے چہچہائیں گے پرندے پھر منڈیروں پر
چلے آؤ در و دیوار تم کو یاد کرتے ہیں

درسِ غیرت

یا ضرورت ہے رہینِ مہ و پرویں ہونا
شام بھی سیکھ نہ لے کیوں سحر آگیں ہونا

جلوہ محدود نہیں ہے تو نظر کیوں محدود
عیب نظارہ ہے وقفِ گل و نسریں ہونا

لے لیا دھوپ میں جل جل کے فروغِ خورشید
آگیا خاک کے ذرّوں کو بھی زرّیں ہونا

پشِ مہر کو جھیلا تو بڑھی سرخیِ رُخ
کوئی دیکھے اُفقِ شام کا رنگیں ہونا

خاک بن خاک سے پھر جامِ سفالیں بن جا
چاہتا ہو جو حریفِ لبِ شیریں ہونا

رکھ نہ اغیار سے امیدِ چمن بندی کی
کہ تجھے چاہیئے خود باغ کا گلچیں ہونا

عزم و ایثار و صداقت ہو تو دشوار نہیں
فقرا کیلئے ہمدوشِ سلاطیں ہونا

زندگی کیلئے قیدیں تو بہت ہیں لیکن
شرطِ اوّل ہے فدائے وطن و دیں ہونا

چاہیئے اب کوئی جدت مری مظلومی کی
ظلم نے سیکھ لیا معدلت آگیں ہونا

ایسی پرواز پہ ہے فلسفۂ ردِّ عمل
جو سکھا دے گی کبوتر کو بھی شاہیں ہونا

خواجہ۔ وہ کسرِ مزاجی کا زمانہ نہ رہا
وقت کہتا ہے کہ اب چاہیئے خود بیں ہونا

سادگی ترک ہوئی جاتی ہے اے حضرتِ شیخ
چاہیئے آپ کو بھی مائلِ تزئیں ہونا

خود پسندی کے زمانے میں تواضع کیسی
چھوڑ اے پیرِ حرم گریۂ مسکیں ہونا

اُس مُبَصِّر کیلئے خودنگری عیب نہیں
جس کو آتا ہی نہ ہو غیر پہ بد بیں ہونا

عزم و ہمت کو تو اس دل کو ضرورت ہے شفیقؔ
جانتا ہو نہ مصیبت میں بھی غمگیں ہونا

تاج محل آگرہ

زہے جلوے آگرے کی سرزمیں سے آشکار اب تک
نظر آتے ہیں کچھ پہلے کے آثارِ بہار اب تک

ہے فرزندِ نظارہ تاج گھر پامال ہو کر بھی
نمایاں ہے عروسِ حسن کا پہلا سنگار اب تک

کسی کی خوابگاہِ ناز پر رحمت برستی ہے
کھڑی رہتی ہے صف باندھے فرشتوں کی قطار اب تک

زبانِ حال سے کہتے ہیں غنچے اس گلستاں کے
کہ حوریں بھی پہنتی ہیں مرے پھولوں کے ہار اب تک

ملائک جن کا خاکہ لے گئے بُستانِ جنت میں
نظر آتے ہیں دیوار و در پہ وہ نقش و نگار اب تک

کہے دیتی ہے جلوؤں کی فضا آنکھ والوں سے
یہاں روپوش ہے کوئی عروسِ نو بہار اب تک

گزرگاہِ حسیناں ہے، نمائش گاہِ خوباں ہے
اسے کہتے ہیں ملکِ ہند کا دار القرار اب تک

یہ وہ گلزارِ فیض آثار ہے اے دیکھنے والو
کہ ہوتی ہے بہارِ خلد آ آ کر نثار اب تک

وہ نقشہ ہے وہ جلوہ ہے وہ رونق ہے وہ عالم ہے
بہارِ قدس ہے جس کی فضا سے ہمکنار اب تک

خطیبانِ گلستاں کے منابر ہیں کہ شاخیں ہیں
پڑھی جاتی ہے جن پر حمدِ پاکِ کردگار اب تک

چلے طوفان کے جھونکے ہزاروں انقلاب آ کے
لئے ہے گود میں جمنا کا ساحل یہ بہار اب تک

بچشمِ غور دیکھو اس عمارت کے مناظر کو
کہ ہے شاہانِ مغلیہ کی عظمت آشکار اب تک

شفیق ایسی نفاست اس عمارت سے نمایاں ہے
کہ بوسے لے رہی ہے صنعتِ پروردگار اب تک

سحر

اے سحر کس جلوہ گاہِ ناز سے آتی ہے تو
عالمِ ہستی کے ہر ذرّے کو چمکاتی ہے تو

عالمِ امکاں کے ہر گوشے کو مہکاتی ہے تو
کون سے یوسف کے پیراہن کی بو لاتی ہے تو

دل لئے لیتی ہے تیری جلوہ پاشی کی ادا
کس حریمِ ناز سے ہوتی ہوئی آتی ہے تو

کھل گئیں آنکھیں منوّر ہو گئے سب کے قلوب
ہر طرف عرشِ بریں کا نور پھیلاتی ہے تو

اپنے مشتاقوں کو دیوانہ بنانے کے لئے
بن سنور کر کھول کر بندِ نقاب آتی ہے تو

شب کی تاریکی کا دامن چاک ہو جاتا ہے جب
گود میں خورشید عالمتاب کو لاتی ہے تو

یہ تری شانِ حیا بھی کیا انوکھا ناز ہے
اپنے سورج کو نمایاں کر کے چھپ جاتی ہے تو

شبِ ماہ

وہ روشنی ہے دن نظر آتا ہے رات میں — آتا ہے کون انجمنِ کائنات میں

کیا چاندنی کا فرش بچھا ہے زمین پر — لیلائے چرخ جلوہ نما ہے زمین پر

اک دھوم سی ہے کوچہ و بازارِ دہر میں — گویا بہار آئی ہے گلزارِ دہر میں

چشموں پہ ماہتاب کا پڑتا ہے عکس جب — ہوتا ہے آشکار عجب منظرِ طرب

موجوں کا سطحِ آب پہ وہ خوشنما سماں — گویا بروئے آب لہکتی ہیں بجلیاں

اے ماہتاب کس نے یہ جلوہ دیا تجھے — کس آفتابِ حسن نے چمکا دیا تجھے

میں جانتا ہوں اس لئے تو نور ریز ہے
پردے میں تیرے حسنِ ازل جلوہ ریز ہے

وہ جلوہ گاہ کہاں ہے مجھے بتا جگنو — جہاں سے تجھ کو ملی تابش و ضیا جگنو
جو دیکھتا ہوں تو چھوٹا سا جاندار ہے تو — مگر خدا کی خدائی میں اک بہار ہے تو
تری چمک پہ یہ دھوکا ہوا مجھے کہ ضرور — اندھیری رات میں برسات کی ہے بارش نور
چراغِ طور ہے نورِ جمال یار ہے تو — ضرور جلوۂ جاناں کا رازدار ہے تو
یہ صاف صاف ہویدا ہے تیری صورت سے — ملا ہے نور تجھے شاہدِ حقیقت سے
تجلیوں کا تلاطم ہے تیرے سینے میں — کہ ماہتاب کا عکس آپڑا نگینے میں

اندھیری رات میں تو نے سبق دیا ہے مجھے
کہ ہو غیور تو اپنی ہی روشنی میں چلے

پتنگ

اڑانا چاہے جو وہ شوخ بے نقاب پتنگ
خطِ شعاع بنے ڈور آفتاب پتنگ

بلند ہو کے یہ لیتا ہے لطف نظارہ
کہ دیکھتا ہے حسینوں کو بے نقاب پتنگ

خط اڑ گیا جو لکھی اضطراب کی حالت
ہمارا نامۂ غم تھا کہ لاجواب پتنگ

فضائے چرخ میں کرتا ہے جھوم جھوم کے رقص
کہ پا گیا ہے کسی مست کا شباب پتنگ

ہوائے عشق کسی کی اڑائے پھرتی ہے
بنا ہوا ہے شفیقی دلِ خراب پتنگ

کچھ مرے پاس نہیں شرم و ندامت کے سوا
حشر میں کسکو پکاروں تری رحمت کے سوا

بارہا حضرتِ واعظ کے بیانات سُنے
کچھ نہ معلوم ہوا دوزخ و جنت کے سوا

حضرتِ شیخ کہاں اور کہاں میخانہ
کیا کہوں پیرِ مغاں تیری کرامت کے سوا

کون ہے اُجڑے ہوئے گھر کا بسانے والا
بیکسی تیرے سوا یا شبِ فرقت کے سوا

خوب سوچا تو نہ نکلا کوئی دشمن اپنا
انکی پہلی نظرِ لطف و عنایت کے سوا

تجھ سے تیرا ہی طلبگار ہے دیوانہ شفیق
کچھ بھی درکار نہیں تیری محبت کے سوا

وہی سعیِ عمل کا وقت تھا جب لطفِ خواب آیا
کھلی ہے آنکھ جب پہنچی کہ سر پر آفتاب آیا

نہیں ممکن کہیں اس کا ٹھکانہ دین و دنیا میں
تمھارے آستانے سے بھی جو ناکامیاب آیا

اُمنگیں اہلِ دل کی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے
کہ تم پر کیا بہار آئی زمانے پر شباب آیا

ہجوم عام تھا کل اُن کی محفل میں مگر پھر بھی
مجھے دیکھا تو کیا کیا غیظ کیا کیا پیچ و تاب آیا

کفِ نازک میں اُن کے باگ ہے گویا زمانے کی
جہاں رخ سے نقاب اٹھی جہاں میں انقلاب آیا

شبِ وصل اگلی باتوں کا تصور بھی تھا لطف انگیز
انھیں تو شرم آتی ہی تھی ہمکو بھی حجاب آیا

شفیقؔ افسوس توبہ کرکے ہم تا عمر پچھتائے
طبیعت رہ گئی للچا کے جب نظر پر شراب آیا

حجابِ قدس ہے پردہ کسی حسنِ مجسم کا
کہ جسکی رونمائی راز ہے تخلیقِ عالم کا

عجب انداز ہے قاتل مرے زخموں کے کمانم کا
ذرا سا منہ نکل آتا ہے سنکر نام مرہم کا

تڑپ کر ایکدن تڑپائیں گے ہم ساری دنیا کو
کسی نے بھر دیا ہے درد دل میں سارے عالم کا

زبانِ حال سے کہتی ہے مہر و ماہ کی گردش
کہ دنیا ایک محشر ہے کسی کے حسنِ برہم کا

مرے میخانے میں دن رات دورِ جام چلتا ہے
نہیں دستور قیدِ انتظارِ وقت و موسم کا

ارے ساقی پلاتا جا کہ اب تو بیخودی مجھکو
پتہ دینے لگی ہے ایک نامعلوم عالم کا

تغیر پر تغیر ہو رہا ہے دہر میں پھر بھی
ازل سے آجتک مقصود ہے تو سارے عالم کا

وہ تا حدِ نظر تا صبح یادِ یار کا جلوہ!
نہیں جاتا شفیقؔ اب تک تصور اس شبِ غم کا

اس بدگماں کو اور بھی ہشیار کردیا — یہ کیا کیا کہ شوق کا اظہار کردیا

کیا ظلم تو نے اے نگہ یار کردیا — جینا کسی غریب کا دشوار کردیا

بیخود بنا کے اور بھی ہشیار کردیا — ساقی نے دو جہاں سے خبردار کردیا

کہتے تو ہو کے صاف کہو دل کا مدعا — تم نے اگر زبان سے انکار کردیا

تھا اے جنوں یہی دلِ شوریدہ کا علاج — اچھا کیا کہ خاکِ رہِ یار کردیا

کٹتا ہے گھٹ کے دن تو گزرتی ہے رو کے رات — تم کیا چلے گئے مجھے بیکار کردیا

یا میری زندگی کا سبب تھا خیالِ دوست — یا زندگی کے نام سے بیزار کردیا

اے سروِ ناز آ ترے صدقے خوش آمدید — اُجڑے ہوئے مکان کو گلزار کردیا

اس دل نے دو جہاں کی خوشی بخشدی شفیق
جس دن سے ان کے غم میں گرفتار کردیا

چمن میں بے صدا کوئی نہیں ہے — مگر آتش نوا کوئی نہیں ہے

وہاں لائی ہے تیری آرزو اب — جہاں تیرے سوا کوئی نہیں ہے

کمی ہے درد مندوں کی نہ جانے — کہ اب درد آشنا کوئی نہیں ہے

خداوندانِ دولت جانتے ہیں — غریبوں کا خدا کوئی نہیں ہے

میں خود اُس پار لے جاؤنگا کشتی — بلا سے نا خدا کوئی نہیں ہے

خود اپنا دل اگر ہے خوگرِ اُنس — تو پھر نا آشنا کوئی نہیں ہے

یہی ہے فیصلہ اہلِ نظر کا — کہ تم سا دوسرا کوئی نہیں ہے

ملیں گے قدردانِ دل ہزاروں — نہیں ہو تم تو کیا کوئی نہیں ہے
ادھر بھی اک نظر اے رحمتِ حق — کہ مجھ سا پُر خطا کوئی نہیں ہے
وہاں پیغام آخر کس سے بھیجوں — سُن اے بادِ صبا کوئی نہیں ہے

سگِ دنیا تو لاکھوں ہیں شفیقؔ آج
مگر شیرِ خدا کوئی نہیں ہے

انکی غیرت متحمل نہیں عریانی کی — حُسن نے آپ نگاہوں کی نگہبانی کی
تم نے کیوں پرسشِ حالِ غمِ پنہانی کی — اور بھی زخمِ جگر پر نمک افشانی کی
حاصلِ زیست نہ ہو کیوں حرمِ دوست کی خاک — جس سے بنیاد پڑی خلقتِ انسانی کی
بن گئی میری خطا باعثِ الطاف و عطا — ان سے دیکھی نہ گئی شکل پشیمانی کی
آج فریادِ اسیری پہ ترس آ ہی گیا — بیڑیاں توڑنے آئے ہیں وہ زندانی کی
مژدہ اے نالۂ شبگیر و فغانِ سحری — یادِ محبوب نے پھر سلسلہ جنبانی کی
یاد آتے ہیں وہ کہسار و بیاباں اکثر — مدتوں ہم نے جہاں چاک گریبانی کی
نہ گلستاں میں بہاروں کا وہ عالم باقی — نہ بیاباں میں وہ رونق رہی ویرانی کی
شعر و موسیقی و آوازِ ترنم کب تک — اب زمانے کو ضرورت ہے رجز خوانی کی
کیوں نہ کشتی کے چلانے کا طریقہ سیکھا — ہم کو دریا سے شکایت نہیں طغیانی کی

اے شفیقؔ آج کہاں قوم میں ایثارِ خلیل
دل ہے بے ذوق مگر رسم ہے قربانی کی

یوں تصوّر میں بسر رات کیا کرتے تھے
لب نہ کھلتے تھے مگر بات کیا کرتے تھے

ہائے وہ رات کہ سوتی تھی خدائی ساری
ہم کسی در پہ مناجات کیا کرتے تھے

یاد ہے بندگیِ اہل محبت جس پر
آپ بھی فخر و مباہات کیا کرتے تھے

ہم کبھی معتکفِ کنج حرم ہو کر بھی
سجدۂ پیر خرابات کیا کرتے تھے

یاد کرتا ہے اُسی عہد گزشتہ کو شفیق
تم جب الطاف و عنایات کیا کرتے تھے

تقاضے عشق کے بھی حسن و الفت سے نہ کم نکلے
حدودِ شوق سے باہر تم نکلے نہ ہم نکلے

نہ کیوں رسم و رہِ آئین ملّت کا بھرم نکلے
کہ خود شیخ و برہمن دشمن دیر و حرم نکلے

نگہباں رو دیے در تک وہ خود با چشم نم نکلے
قیامت خیز منظر تھا جب اس کوچے سے ہم نکلے

جہاں کی ہر خوشی صدقے ہو ایسے رونے والے پر
وہ جانِ آرزو جسکا شریکِ اشکِ غم نکلے

مجھے تو احترامِ حسن بھی ملحوظ رکھنا تھا
مری آہوں پہ تم پردے سے کیوں با چشم نم نکلے

وہ منزل بھی کہ ہو جاتی جہاں جنبش پہاڑوں کو
بلائیں جھیلنے والے جہاں ثابت قدم نکلے

ملائک بھی شفیق اس راز سے سر در گریباں ہیں
کہ یہ مٹی کے پتلے وارثِ لوح و قلم نکلے

○

ابھی سے کر لیں مشق بادہ خواری
لب کوثر پہ ہوگی میگساری

جہاں سے اُٹھ گئی کیا رسم یاری
نہ کی تم نے بھی قدر جاں نثاری

چمن کو پھونک دینگے میرے نالے
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری

اُٹھے کیا فتنۂ محشر کہ ظالم
قیامت ہے ترے قدموں کی ماری

بھلا دیتے شفیق اُس بیوفا کو
اگر مانع نہ ہوتی وضعداری

دلِ سودا طلب کا حالِ مجنونانہ کیا کہیے
بنا رکھا ہے کس ہشیار نے دیوانہ کیا کہیے

یہ کس نے لوٹ لی ہے رونقِ میخانہ کیا کہیے
سبو اُلٹا ہوا، ٹوٹا ہوا پیمانہ کیا کہیے

وفا کی رسم باقی ہے نہ ذوقِ عشق دنیا میں
کسی سے داستانِ بلبل و پروانہ کیا کہیے

ابھی تک رو رہے تھے ہم صفیروں کی جدائی کو
اُٹھا گلزار سے اپنا بھی آب و دانہ کیا کہیے

حدیثِ بزم شب یا سرگزشت اہل محفل اب
بجز افسانۂ خاکستر پروانہ کیا کہیے

بہت کرتا ہوں سعیِ ضبط پھر بھی سن کے نام اُنکا
نکل جاتی ہے دل سے آہ بیتابانہ کیا کہیے

وہ آئے زندگی لیکر، گئے ساری خوشی لے کر
سُنا کر قصۂ شب صبح کا افسانہ کیا کہیے

کیا کرتا ہے ساری رات ذکرِ زلفِ جاناں
نہ سوتا ہے نہ سونے دے دلِ دیوانہ کیا کہیے

نہ جانے کیوں مجھے وہ دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں
اسے بیگانگی یا نازِ معشوقانہ کیا کہیے

بہارِ گل میں یوں بھی ڈر ہے توبہ ٹوٹ جانے کا
پھر ایسے میں فریبِ نرگسِ مستانہ کیا کہیے

سحر تک کروٹیں بدلے کہانی ہو تو ایسی ہو
کسی کو سُن کے نیند آجائے وہ افسانہ کیا کہیے

بظاہر سادگی، در پردہ اندازِ ستمگاری
نگاہِ ناز تیرا شیوۂ ترکانہ کیا کہیے

مرے اُجڑے ہوئے گھر میں کبھی تھا میہماں کوئی
یہ ویرانہ سہی لیکن اسے ویرانہ کیا کہیے

مزے وہ نامہ و پیغام کے آغازِ اُلفت میں وہ ہر دم انتظارِ قاصد جانانہ کیا کہئے

شفیق باوفا سے آپ کی یہ غیریت کیسی
اگر اپنا نہ کہیے تو اُسے بیگانہ کیا کہئے

کسی دن جذبِ الفت رشک کے قابل نہ بن جائے
تمہارا دل کہیں دیکھو ہمارا دل نہ بن جائے

تمہیں کو ڈھونڈھتی ہیں کافر دیں دار کی نظریں
تمہارا حُسن معیارِ حق و باطل نہ بن جائے

جبیں کو سجدے کی لذّت میسر ہو نہیں سکتی
وہ جب تک آستانِ یار کے قابل نہ بن جائے

خرامِ ناز سے روحِ محبت پھونک دی تو نے
ترے کوچے کا ہر ذرّہ سراپا دل نہ بن جائے

سلیقہ چاہیئے کشتی سے پہلے ناخدائی کا
انھیں موجوں کا دامن دامنِ ساحل نہ بن جائے

کبھی میں دل کی مظلومی کا قائل ہو نہیں سکتا
تری نظروں میں جب تک رحم کے قابل نہ بن جائے

محبّت اس بُتِ کافر کی جاتی ہی نہیں یارب
مرا ایمان، میری جان، میرا دل نہ بن جائے

نقابِ روئے لیلیٰ کا سرک جانا تو ممکن ہے
غبارِ قیس خود ہی پردۂ محمل نہ بن جائے

اگر صحت ہو بیمارِ محبّت کے مقدّر میں
تو اُن کا درد و غم ہی چارہ سازِ دل نہ بن جائے

نقاہت جوش پر ہے ناتوانی ہے ترقّی پر
کہیں پہلی ہی منزل آخری منزل نہ بن جائے

دلِ پُر سوز احسان تا کجا خورشید و انجم کے
خود اپنی خاک کا ذرّہ مہِ کامل نہ بن جائے

جمال آرائیاں اور آدمِ خاکی کے پیکر میں
تجلّی آپ کی پابندِ آب و گِل نہ بن جائے

شفیقؔ احساس پر دار و مدارِ رنج و راحت ہے
ہماری بزمِ غم کیوں عیش کی محفل نہ بن جائے

○

دلِ غریب کا مدت پہ انتخاب ہوا
کہ رات انکی حضوری میں باریاب ہوا
بدل سکے نہ گدایانِ میکدہ ساقی
ہزار بار زمانے میں انقلاب ہوا

نکل سکی نہ تمنّائے دید عاشق کی — اُٹھی نقاب تو وہ حسن خود نقاب ہوا
جزائے خیر دے اللہ حسن والوں کو — کسی کے دل کا دکھانا انھیں ثواب ہوا

رہی کبھی نہ سلامت شفیق کی توبہ
ہزار مرتبہ وہ تارکِ شراب ہوا

قلندر ہو تو ہو لوح و قلم پر اقتدار اپنا — زمین و آسماں اپنے ہیں جب پروردگار اپنا
حقارت کی نگاہوں سے نہ دیکھو دلق پوشوں کو — انھیں بندوں کو قدرت نے دیا ہے اختیار اپنا
خودی قائم رہے تو فخر سلطانی ہے درویشی — فقط احساس کی پستی سے مٹتا ہے وقار اپنا
کبھی ویران ہوتا ہے چمن بے التفاتی سے — بسا دیتا ہے ویرانہ کبھی ذوق بہار اپنا
پیام جاودانی دے رہی ہے زندگی ہم کو — مگر خود ہی نہیں ہے زندگی پر اعتبار اپنا
ضرورت ہے کہ پیدا کیجئے شمشیر کی طاقت — اگر شمشیر اپنی ہے تو سارا اقتدار اپنا
اسی تلوار کے نیچے ہماری زندگی بھی ہے — اسی تلوار کے نیچے بنائینگے مزار اپنا
وہ چاہے نیل کا طوفان ہو یا رودِ گنگا کا — مگر دامن بچا جاتا ہے مردِ ہوشیار اپنا

شفیق اپنی شکایت بھی سنی جاتی تھی وقعت سے
اور اب تو حمد بھی سنتا نہیں پروردگار اپنا

○

الفت میں جدا سب سے طریقہ ہے ہمارا — نقشِ قدمِ یار پہ سجدا ہے ہمارا
یہ خوب ہے عشاق کی تسکین کا پہلو — کہتے ہیں کہ ہر چیز میں جلوا ہے ہمارا

آتی ہے برابر یہ صدا راہ طلب میں
جو کچھ نظر آتا ہے کرشما ہے ہمارا

رندوں کو ذرا بھی نہیں اندیشۂ عقبےٰ
کہتے ہیں خدا بخشنے والا ہے ہمارا

جب تم نہیں اپنے تو کوئی بھی نہیں اپنا
جب تم ہو ہمارے تو زمانہ ہے ہمارا

دیوانہ تمھارا ہمیں کہتا ہے زمانہ
تم بھی کبھی کہتے کہ یہ شیدا ہے ہمارا

جس روز سے خاک قدم یار بنا ہے
نازاں اسی دن سے دل رسوا ہے ہمارا

بگڑی ہے جوان سے تو خوشامد ہے عدو کی
جو کام ہے دنیا سے نرالا ہے ہمارا

مشکل ہے نشیمن کی اجازت بھی وہاں آج
جس باغ کے ہر پھول پہ دعوا ہے ہمارا

ہم وہ ہیں کہ پلتا تھا زمانہ کبھی ہم سے
اب غیر کے ٹکڑوں پہ گزارا ہے ہمارا

غیروں سے ہمیں کوئی شکایت نہیں ہمدم
جو کچھ ہے وہ احباب سے شکوا ہے ہمارا

یہ کہہ کے ہمیں بخشدیا اس نے شفیقی
آخر یہ گنہ گار بھی بندا ہے ہمارا

دوئی کا ذکر ہی بعد فنا کیا
کہوں قطرے کو دریا کے سوا کیا

محبت جس کو دیوانہ بنادے
نظر آئے اُسے اچھا بُرا کیا

شکایت بن گئی شکر جفا بھی
کسی نے کیا سُنا میں نے کہا کیا

کوئی بھی پوچھنے والا نہیں ہے
ہماری بیکسی کا پوچھنا کیا

چرایا گر نہیں تم نے تو آخر
مرے پہلو سے میرا دل ہوا کیا

بیان عشق و الفت اور ناصح
ہوا وہ بھی انھیں پہ شفقتا کیا

نہ آتے ہو نہ بلواتے ہو ہم کو نہ جانے ہو گئی ہم سے خطا کیا
کسی میں بھی نہیں بوئے محبت جہاں سے اُٹھ گئی رسمِ وفا کیا
وہ ہم پر مہرباں ہیں آجکل کیوں نہیں اب کوئی ملتا باوفا کیا

کوئی جب ذکر کرتا ہے تمھارا
تو روتا ہے شفیق زار کیا کیا

بے کیف ہجر و وصل کی ہر داستاں ہے اب
دل ہے مگر وہ ولولۂ دل کہاں ہے اب
کیوں ذوق بے نیاز بہار و خزاں ہے اب
یارب مرا وہ عہدِ جوانی کہاں ہے اب
جب تم خلاف تھے تو زمانہ خلاف تھا
تم مہرباں ہوئے تو جہاں مہرباں ہے اب
جاتا رہا جو دل سے وہ احساس رنج و غم
آنسو ہیں آنکھ میں نہ زباں پر فغاں ہے اب
وہ کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا
یارب نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب
شیخ حرم سے کام نہ زاہد سے واسطہ
بس میں ہوں اور صحبتِ پیر مغاں ہے اب

مقبول ہو رہی ہے مری شاعری شفیق
جو داغؔ کی زباں تھی وہ میری زباں ہے اب

دیر میں بھی ہیں حرم میں بھی نمودار ہیں آپ
باعثِ تفرقۂ کافر و دیں دار ہیں آپ

ناز بردار، وفا کیش، وفادار ہوں میں
ستم ایجاد، جفا کوش، جفا کار ہیں آپ

کوئی گالی تو نہ تھی آپ کو دلبر کہنا
کیوں بڑی دیر سے زحمت کشِ پیکار ہیں آپ

میری تعریف ان الفاظ سے کی جاتی ہے
رند مشرب ہیں قدح نوش ہیں میخوار ہیں آپ

بن کے انجان کوئی پوچھ رہا ہے مجھ سے
کون ہے جس کی محبت میں گرفتار ہیں آپ

یہ بھی پردہ ہے کوئی چھپتے ہیں پردہ بنکر
جب سے روپوش ہوئے اور نمودار ہیں آپ

دیکھتے ہی انھیں ناصح پہ بھی آفت آئی
جان دینے کیلئے عشق میں تیار ہیں آپ

چھپنے دیتی ہے کہیں حسنِ جوانی کی نمود
لاکھ پردوں پہ بھی رسوا سر بازار ہیں آپ

غیر نے کل مرے بارے میں جو پوچھا اُن سے
ہنس کے بولے کہ شفیق جگر افگار ہیں آپ

دشمنوں پر ہے عنایت کی نظر سچ ہے کہ جھوٹ
دشمنوں کے کان بہرے یہ خبر سچ ہے کہ جھوٹ

مجھ سے اب پردے میں چھپتے ہو خدا کی شان ہے
چھپ کے تم آتے تھے پہلے میرے گھر سچ ہے کہ جھوٹ

جس کو بھولے سے نہ آتا تھا عیادت کا خیال
آج وہ آنے کو ہے اے چارہ گر سچ ہے کہ جھوٹ

کس خوشی کے ساتھ سنکر میرے مرنے کی خبر
پوچھتا ہے غیر سے بیداد گر سچ ہے کہ جھوٹ

وہ بلائیں گے مجھے مجکو یقیں آتا نہیں
تیرے صدقے سچ بتا اے نامہ بر سچ ہے کہ جھوٹ

آپ مائل ہیں کسی کافر پہ سنتا ہوں شفیق
آپ ہی ایمان سے کہیے خبر سچ ہے کہ جھوٹ

غازۂ روئے سحر ہے جلوۂ رخسار دوست
نکہتِ جنت ہے بوئے کاکلِ خمدار دوست

دیکھ کر کہتا ہے دل رنگینیٔ رخسار دوست
عمر بھر کرتے رہو گلچینیٔ گلزار دوست

تیرے نظارے پہ ہے موقوف اپنی میکشی
تیری مستی کی قسم اے چشمِ کوثر بار دوست

مدتیں گزریں تکلّم کا مزا لوٹے ہوئے
آجتک کانوں میں گونجی ہے وہی گفتار دوست

غیرتِ صد طور ہے آئینہ دارِ نور ہے
جنت المعمور ہے ہر کوچۂ و بازار دوست

ہے شرابِ حسن کا چھڑکاؤ خشت و سنگ پر
مست ہے سرشار ہے اک اک در و دیوار دوست

اس سے بڑھ کر لائق یاری نہیں کوئی شفیق
بیکسی میں وقت پر ہوتا ہو جو غمخوار دوست

یہ سوچتا تھا انھیں وعدۂ و پیام کے بعد
کہ کیا کرے گا کوئی انتظار شام کے بعد

بہارِ باغ کا کیا ذکر ہے کہ زنداں میں
چمن بنے گا اسیری کے انتقام کے بعد

وفا کو عرض تمنا بھی شان ہے اُن سے
شکایتِ غمِ ہجراں کے اہتمام کے بعد

سمجھ میں آیا کہ عصیاں کا مرتبہ کیا ہے
ہزار بندگی و سجدۂ و قیام کے بعد

وہ انقلاب بھی آنے کو ہے زمانے میں
کہ جب خواص پہ ہوگی نظر عوام کے بعد

جو روشنی ہو تو ظلمت کی قدر ہو معلوم
کھلی ہے رات کی رنگت چراغِ شام کے بعد

نگاہ میں ہے رہِ دوست کا سماں اب تک
وہ ایک عالمِ حیرت ہر ایک گام کے بعد

گئے تھے لیکے وہاں شوقِ گفتگو کیا کیا
ادب نے کچھ بھی نہ کہنے دیا سلام کے بعد

ہجومِ حشر میں دیکھا انھیں تو کیا دیکھا
خصوصیت بھی تو ہو التفات عام کے بعد

دکھا رہے ہیں وہ چلمن سے اسلئے جلوہ
کہ اور شوق بڑھے لطف ناتمام کے بعد

سحر کے بعد سحر دلنواز ہوتی تھی
چلے گئے ہیں تو شام آرہی ہے شام کے بعد

دم اخیر بھی بھولا نہ اپنا فرض شفیق
زبان بند ہوئی ہے تمھارے نام کے بعد

گیا ہے کوئے قاتل میں سلام عاشقاں لے کر
کہیں پلٹے نہ یارب ہاتھ میں قاصد زباں لے کر

پلٹتا تھا مریضِ غم کی جان ناتواں لے کر
کہاں جاتی ہے یادِ یار دل میں چٹکیاں لے کر

پئے تسکین خاطر آئے تھے ہم کوئے جاناں میں
یہاں سے جائیں یارب دلکی بیتابی کہاں لے کر

وہ منظر تھا کہ سب سوئے ہوئے ارمان جاگ اٹھے
ترا بستر سے اٹھنا صبح کی انگڑائیاں لے کر

خوشا تیرے قدم کی خاک اے سلطانۂ خوبی
کہ جاتی ہے نسیم باغ جنت ارمغاں لے کر

بہار آئے تو اب کے میفروشاں کا ارادہ ہے
چلیں طوفِ حرم کو ساغر و مے کی دکاں لے کر

نشانِ رفتگاں پاکر بڑھی اور اپنی بیتابی
بہت رویا کئے دامن میں گردِ کارواں لیکر
نشیمن کے خس و خاشاک تک آتش بداماں ہیں
بہار اب کے برس آئی چمن میں بجلیاں لے کر
یہ کیسا انقلاب آیا کہ جینا بھول بیٹھے تم
ہم آئے تھے جہاں میں زندگی کی داستاں لیکر
شفیق رند پر کیا ختم ہے اے حضرت واعظ
گیا زاہد بھی فیضِ حضرت پیر مغاں لے کر

ملا عشق کا لطف برباد ہوکر — غم دین و دنیا سے آزاد ہوکر
مرے خانۂ دل کا عالم نہ پوچھو — یہ آباد ہوتا ہے برباد ہوکر
کچھ ایسا ستایا ہوا ہوں کہ منہ سے — نکلتی ہے ہر بات فریاد ہوکر
اب ایک ایک ذرہ کسی کی گلی کا — ستانے لگا ہم کو جلّاد ہوکر

شفیق وفادار نے جان دیدی
تمھاری محبت میں برباد ہوکر

اک مرقع ہے ہر اک دیوار و در تیرے بغیر — تیری ہی تصویر ہے پیش نظر تیرے بغیر
آ ہٹا کر منہ سے برقع زلف بکھرائے ہوئے — کس قدر بے کیف ہے شام و سحر تیرے بغیر

زندگی ایسی ہے جیسے نزع کے عالم میں ہوں
بس نگاہِ واپسیں ہے ہر نظر تیرے بغیر

جسکے جھونکے روح کو بیدار کرتے تھے کبھی
رنج دیتی ہے وہی بادِ سحر تیرے بغیر

آہ کیا راحت فزا تھا تیرے خط کا انتظار
اب کہاں وہ اشتیاقِ نامہ بر تیرے بغیر

ہر قدم پر یاد آتی ہے ترے جلوہ کی رات
مجکو رلواتی ہے تری رہ گزر تیرے بغیر

وہ شبِ غم خود فراموشی کا عالم ہائے ہائے
نیند آئی تھی بانداز دگر تیرے بغیر

اپنے خوابِ ناز سے فرصت نہیں ملتی تجھے
کروٹیں لیتا ہے کوئی رات بھر تیرے بغیر

آکہ اے ساقی پڑے ہیں خاک پر جام و سبو
میکدے کا میکدہ ہے نوحہ گر تیرے بغیر

گلشنِ کشمیر کی نکہت، لبِ جو کی بہار
بن گئی ہے ایک خوابِ مختصر تیرے بغیر

سر چڑھا کر تو نے دی غیروں کو بھی دل میں جگہ
پھر گئی ہم سے زمانے کی نظر تیرے بغیر

کون اب سُن کر مری فریاد سینہ تھام لے
نالے کب ہوتے ہیں ممنونِ اثر تیرے بغیر

اپنے غمخانے سے تھا میں شاکی بے رونقی
ہائے اب سنسان ہے تیرا ہی گھر تیرے بغیر

اک پیامِ غم ہے ہر بزمِ طرب میرے لئے
ہر ترانہ نالۂ مرغِ سحر تیرے بغیر

کون یہ میرے نصیر الدین علوی سے کہے
آہیں بھرتا ہے شفیق آٹھوں پہر تیرے بغیر

نظر آتی ہے ہر موقع پہ پستی کی مثال اب تک
ہے دورِ علم و فن میں بھی وہی ذہن و خیال اب تک

کسی نے کی تھی سجدوں کی شکایت مدتیں گذریں
عرق آلودہ ہے اپنی جبینِ انفعال اب تک

جنوں میں بھی ہے خاکِ رہ گزر کا احترام اتنا
نہیں ان کی گلی میں پاؤں رکھنے کی مجال ابتک

درِ دولت پہ ہوں عفوِ خطا کا ملتجی کب سے
کئے جلتے ہیں لیکن آپ اظہارِ ملال ابتک

بہت چاہا نظامِ گردشِ دوراں بدل جائے
مگر اپنی گذرتی ہے بقیدِ ماہ و سال ابتک

سکونِ قلب ترکِ آرزو پر بھی نہیں ممکن
ستاتی ہے تری یادِ محبت شیریں جمال ابتک

وفاداری اسے کہتے ہیں مٹ کر رہ گیا لیکن
انھیں قدموں سے لپٹا ہے شفیقِ پائمال ابتک

سادگی کی شان میں بھی ہے وہی خوئے جمال
ان کے ہر انداز میں ہوتا ہے پہلوئے جمال

جس سے پونچھا تھا عرق ان کی جبینِ ناز کا
آج تک آتی ہے اس رومال سے بوئے جمال

اس جمال آرا سے دعوائے محبت ہے مجھے
جسکی گردِ آستاں ہے غازۂ روئے جمال

گا رہے ہوں ہم محبت کا ترانہ صبح دم
ہر درو دیوار سے آتی ہو خوشبوئے جمال

دل گرفتارِ بلا ہے جانِ الجھن میں شفیق
ہم ہوئے جب سے اسیرِ دامِ گیسوئے جمال

گذر گئی جو نشیمن پہ ہم کو کیا معلوم
چمن کا حال اسیرِ ستم کو کیا معلوم

شکستہ حالئ مرغانِ خانۂ صیاد
بھلا کبوترِ بامِ حرم کو کیا معلوم

کلی کا حسنِ سرِ شاخ، گل کی رنگینی
غریب سبزۂ زیرِ قدم کو کیا معلوم

مرے سرورِ مسلسل کا رازِ اے شبنم — تری رمیدگیِ صبح دم کو کیا معلوم
مرے لبوں سے مزا پوچھ مسکرانے کا — کہ رونے والے تری چشمِ نم کو کیا معلوم
مسرتِ ابدی ہے مقامِ صبر و رضا — یہ راز یارانِ حکایاتِ غم کو کیا معلوم
مقامِ سجدہ گذارانِ آستانۂ دوست — فریب خوردۂ دیر و حرم کو کیا معلوم

شفیق خاک نشینانِ عشق کی عظمت
ذرا بہ کرسی و لوح و قلم کو کیا معلوم

جس کو شانِ رضا نہیں معلوم — زندگی کا مزا نہیں معلوم
عشق کی ابتدا تو جانتے ہیں — عشق کی انتہا نہیں معلوم
ایک آواز سی تو آتی ہے — سمتِ بانگِ درا نہیں معلوم
یا بتاتے تھے رازِ ارض و سماء — یا خود اپنا پتہ نہیں معلوم
بحرِ الفت میں بہہ گئی کشتی — تھی کدھر کی ہوا نہیں معلوم
لے تو جاتی ہے عاشقوں کا پیام — کیا کہے گی صبا نہیں معلوم
عرض بے سود، التجا بیکار — ان نگاہوں کو کیا نہیں معلوم
حُسن پر ناز کرنے والوں کو — عشق کا مرتبا نہیں معلوم

دوست نے پھیر لی نگاہ شفیق
ہو گئی کیا خطا نہیں معلوم

راہِ غربت کی تھکن میں بھی مزا پاتے ہیں ہم
لیٹے لیٹے منہ پہ دامن رکھ کے سو جاتے ہیں ہم

حسن گریاں، پردہ جنباں، مشکبو زلفیں اداس
اے غمِ ہجراں تڑپتے ہیں کہ تڑپاتے ہیں ہم

ہاتھ سے آئینہ رکھ دیتے ہیں جھک جاتی ہے آنکھ
وہ سماں دیکھے کوئی جب ان کو یاد آتے ہیں ہم

آگیا تھا ایک دن لب پر جفاؤں کا گلہ
آج تک جب ان سے ملتے ہیں تو شرماتے ہیں ہم

وہ خوشی کے دن، ملاقاتوں کی وہ راتیں کہاں
اب تو برسوں اُن کے خط کو بھی ترس جاتے ہیں ہم

وہ نہیں تو کتنا سونا ہے جہاں اپنے لئے
ہے بھری محفل مگر تنہا نظر آتے ہیں ہم

اُن کا آنا، عشق کا آغاز، رسمِ دوستی
چند افسانے ہیں جن سے دل کو بہلاتے ہیں ہم

باوفا ہونے کا دعویٰ ہم نہیں کرتے مگر
تم جو مل جاؤ تو دنیا بھر کو ٹھکراتے ہیں ہم

آگئے تھے سُن کے ہم شہرت تمہاری بزم میں
بارِ خاطر ہیں تو لو اُٹھ کر چلے جاتے ہیں ہم

وقت سے پہلے اجل ہرگز نہ آئے گی شفیق
برق سے ڈرتے نہ طوفانوں سے گھبراتے ہیں ہم

شام شبِ فرقت میں تری یاد کا عالم
لایا ہے ترے حُسنِ سحر زاد کا عالم

میری نگہ یاس نے ایجاد کیا ہے
اک قسم کی خاموش سی فریاد کا عالم

اب خانہ خرابی کی شکایت نہ کروں گا
اللہ رے دل میں مری یاد کا عالم

اے نکہتِ گل سوئے قفس دیکھ کے جانا
اک منتظرِ مدّتِ ومیعاد کا عالم

زنجیر کی جھنکار پہ گاتا ہوں ترانے
رکھتا ہوں اسیری میں بھی آزاد کا عالم

مل جائیں تو اے بادِ صبا ان سے یہ کہنا
دیکھا نہیں جاتا کسی ناشاد کا عالم

آمد زدرم دوش بنے زمزمہ سازے
سرتا بہ قدم حُسن خدا داد کا عالم

ہوتی ہے تمھیں جس کے مٹانے پہ خوشی آج
رُلوائے گا برسوں اُسی ناشاد کا عالم

بے رونقیِ شہر و وطن کیوں ہے شفیق آج
ہر چیز پہ جیسے عدم آباد کا عالم

کیا عشق کا انجام یہ ہم دیکھ رہے ہیں
یا رب انھیں بادیدۂ نم دیکھ رہے ہیں

برسوں سے دلِ زار کو معلوم نہیں کیوں
بیگانۂ ہر شادی و غم دیکھ رہے ہیں

ہر قسم کا جلوہ ہے اک آوارہ نظر میں
تم کو بھی تمھاری ہی قسم دیکھ رہے ہیں

ہم خاک نشینوں کا نظارہ ہے نظارہ
بند آنکھیں ہیں تا لوح و قلم دیکھ رہے ہیں

محروم ہیں اس جلوے سے تیری بھی نگاہیں
اے جانِ دو عالم جسے ہم دیکھ رہے ہیں

کونین کے مالک ہیں گدایانِ درِ دوست
گو ہم اُنھیں بے تاج و علم دیکھ رہے ہیں

دل مست، نظر مست، فضا مست، ہوا مست
کن مست نگاہوں کا کرم دیکھ رہے ہیں

اِک دن جو وہ آئے تھے اُس اُجڑے ہوئے گھر میں
اب تک اُنھیں سر تا بہ قدم دیکھ رہے ہیں

ملحوظ نگاہوں کو ہے کن آنکھوں کی نسبت
کیوں سوئے غزالانِ حرم دیکھ رہے ہیں

سر جھکتے ہی اس در پہ بلندی کا یہ عالم
اب دونوں جہاں زیرِ قدم دیکھ رہے ہیں

کہنے کو تو محدود جگہ رہ گذرِ دوست
اور چار طرف دیر و حرم دیکھ رہے ہیں

مائل بہ تغافل تو نہیں کوئی شفیق آہ
کیوں درد کئی روز سے کم دیکھ رہے ہیں

تیری طلب میں طرفہ مزا پا رہا ہوں میں
تیرے قدم سے تیری طرف آ رہا ہوں میں

کیا ہے جو انتقامِ محبت نہیں ہے یہ
او دشمنِ وفا تجھے یاد آ رہا ہوں میں

وہ دن بھی تھا کہ در پہ نہ دیتے تھے بیٹھنے
یہ دن بھی ہے کہ دل میں جگہ پا رہا ہوں میں

کیا حُسن میرے عشق کا آئینہ بن گیا
خود دیکھتا ہوں خود ہی نظر آ رہا ہوں میں

راہِ طلب میں ذوقِ تصور نہ پوچھئے
جیسے اُنھیں کے ساتھ چلا جا رہا ہوں میں

وقفِ نیازِ غیر نہ ہو گی جبینِ شوق
لے تیرے سنگِ در کی قسم کھا رہا ہوں میں

خلوت بھی بزمِ شعر و ترنم ہے اے شفیق
گویا وہ سامنے ہیں غزل گا رہا ہوں میں

اب وطن میں بھی بہلتا دلِ حساس نہیں
موت لے چل ہمیں دنیا کی ہوا راس نہیں

خود بھی ناکامیٔ قسمت کا مجھے پاس نہیں
جب انھیں کو مرے دکھ درد کا احساس نہیں

اعتماد اپنی محبت پہ ہے دیوانے کو
کرتے جاتے ہیں وہ انکار مگر یاس نہیں

پردہ اک روز اُٹھانا ہی پڑے گا اُن کو
توڑ دے جس کو تغافل وہ مری آس نہیں

اے زہے خشک لبی، ذوقِ شہادت طلبی
کوئی تسنیم بھی بخشے تو کہوں پیاس نہیں

رخصت اے اہلِ چمن اے شبِ مہتاب سلام
پھول اپنے ہیں مگر دیس کی بو باس نہیں

کتنی برسات کے آنے کی خوشی ہوتی تھی
اب یہ موسم بھی ہے بےلطف کہ وہ پاس نہیں

یہ کہنا اے صبا میری طرف سے کوئے جاناں میں
کہ کیا میں ختم کر دوں زندگی کوہ و بیاباں میں

قیامت ایک برپا ہو گئی شہرِ خموشاں میں
نہ آنا تھا انھیں منہ کھول کر گورِ غریباں میں

ہمارے آنسوؤں میں بھی قیامت کی نقاہت ہے
فقط آنکھوں تک آتے ہیں کہ گر پڑتے ہیں داماں میں

محبت کا تقاضا ہے وہیں کی خاک ہو رہئے
ادب کہتا ہے کیونکر پاؤں رکھے کوئے جاناں میں

تمہارے وحشیوں کی ہائے کیا برباد ہے مٹی
بگولے ان کی جانوں کو لئے پھرتے ہیں داماں میں

کبھی اک شاخ گل پر تھا ہمارا آشیانہ بھی
نظر آتے نہیں اب جس کے تنکے بھی گلستاں میں

شکایت کر رہا تھا آج اک دیوانہ قسمت سے
کہ ہم پیدا ہوئے تھے خاک اڑانے کو بیاباں میں

کہاں پھرتی ہے ہمراہ صبا او نکہتِ جاناں
تجھے آرام کرنا تھا تمناؤں کے داماں میں

اسیری کا کوئی صدمہ نہیں رونا تو اس کا ہے
وہ رسوا ہوں گے جب خلقت ہمیں دیکھے گی زنداں میں

مگر شبنم کے قطرے شاہدِ قدرت کے موتی تھے
کہ چن کر لے گئیں سورج کی کرنیں اپنے داماں میں

ابھی تک یاد ہے وہ رہ نوردی دشتِ غربت کی
وہ تھک کر بیٹھ جانا سایہ خارِ مغیلاں میں

شفیق اس کو ملی خوابِ بہشت پاک کی راحت
جسے نیند آ گئی آرام گاہِ کوئے جاناں میں

جشنِ رندان خوشی اوقات کہاں سے لاؤں
اب وہ کھوئے ہوئے لمحات کہاں سے لاؤں

مہرباں ساری خدائی ہو تو کیا ہوتا ہے
ان کے الطاف و عنایات کہاں سے لاؤں

وہی ساون ہے مگر لطف کہاں ساون کا
آہ گذری ہوئی برسات کہاں سے لاؤں

مے و مینا بھی سہی ابرِ بہاراں بھی سہی
محفلِ اہلِ خرابات کہاں سے لاؤں

بجھ گیا دل تو کہاں سوزِ نہاں کے آثار
آتشیں دور کے حالات کہاں سے لاؤں

رہ نوردی کا مزہ کیا کہ گیا عہدِ جنوں
وہ منازل وہ مقامات کہاں سے لاؤں

گھر کی زینت تو ہے تصویرِ حریمِ محبوب
ہائے وہ جادۂ و میقات کہاں سے لاؤں

دن کا دن ذکرِ جنوں فکرِ وفا رات کی رات
سوچتا ہوں کہ وہ دن رات کہاں سے لاؤں

ایک ساغر پہ کروں دولتِ کونین نثار
مگر اے پیرِ خرابات کہاں سے لاؤں

مائلِ دوزخ و جنت ہوں مگر اے واعظ
تیرے افسردہ خیالات کہاں سے لاؤں

ایک ایک گھونٹ پہ بخشش کی دعائیں بھی شفیق
اب وہ رندانہ مناجات کہاں سے لاؤں

تیرے ستم کی انتہا او بتِ فتنہ گر نہیں
چرخ بھی بانیِ جفا ہے مگر اس قدر نہیں

زور پہ ہے جنوں کا جوش، سود و زیاں کا کس کو ہوش
آج ہمارا سر نہیں یا تیرا سنگِ در نہیں

عارض و زلف کی بہار دیکھ رہا ہوں آشکار
ورنہ بہشتِ عشق میں شام نہیں سحر نہیں

میرے خلوصِ عشق کا ان کو بھی اعتراف ہے
میری وفا کا تذکرہ کس کی زبان پر نہیں

آہ شفیقِ مبتلا رات تڑپ کے مرگیا
آپ نے کیا نہیں سُنا آپ کو کیا خبر نہیں

کامل تھا مرا عشق تو ہوتا نہ اثر کیوں
رہتے ہو کئی روز سے بادیدۂ ترکیوں

اے برق فقط شاخِ نشیمن پہ نظر کیوں
ہاں پھونک نہ ڈالا مرے صیاد کا گھر کیوں

گلچیں کی طرف بھی تو ہو صرصر کی توجہ
خرمن پہ غریبوں کے ہے ظالم کی نظر کیوں

منظور تو تھا میرے نشیمن کا مٹانا
گلزار میں کاٹی گئی ہر شاخِ شجر کیوں

لائی ہے کدھر بیخودیِ عشق شفیق آج
بت خانہ نہیں ہے تو جھکا جاتا ہے سر کیوں

جی کسی طرح کسی غم میں سنبھلتا ہی نہیں
لاکھ بہلاؤ دلِ زار بہلتا ہی نہیں

حدّتِ داغِ جگر کے لئے کیا شام و سحر
دن ہو یا رات یہ سورج کبھی ڈھلتا ہی نہیں

عرضِ احوال کی دھن تھی مگر آئے ہیں جو وہ
تو مرے منہ سے کوئی لفظ نکلتا ہی نہیں

آہ کے شعلوں میں بھی قصرِ وفا باقی ہے
آگ دہکی ہے مگر گھر ہے کہ جلتا ہی نہیں

خوگرِ ضبط بنایا ہے وفا نے ایسا
کہ مری آنکھ سے آنسو تو نکلتا ہی نہیں

آپ ہی کے قدمِ ناز سے تھی دل کی بہار
یہ چمن اب تو کبھی پھولتا پھلتا ہی نہیں

ہائے پوچھو نہ اندھیرا شبِ تنہائی کا
آسماں پر کوئی تارا تو نکلتا ہی نہیں

اے زہے شانِ ادب پیرِ خرابات کے پاس	کوئی بھولے سے بھی زانو تو بدلتا ہی نہیں
کیا مرے پاس ہے جُز دردِ ہم داغِ الفت	جو ترے حُسن کے بازار میں چلتا ہی نہیں
انقلابات بہر شام و سحر آتے ہیں	ہم غریبوں کا زمانہ تو بدلتا ہی نہیں
اُن کے آتے ہی قضا ہٹ گئی بالیں سے شفیق
موت کا وقت سُنا تھا کبھی ٹلتا ہی نہیں

دل میں سوزِ عشق بیتابانہ لیکر آئے ہیں	ہم جہاں میں فطرتِ پروانہ لیکر آئے ہیں
آپ استقلال سے دل تھام کر بیٹھیں کہ ہم	آج ساری عمر کا افسانہ لیکر آئے ہیں
اُف یہ مستی، یہ خمار آلود آنکھیں، یہ شباب	آپ اپنے ساتھ اک میخانہ لیکر آئے ہیں
بارہا رندوں کی محفل میں جنابِ شیخ بھی	آرزوئے شیشہ و پیمانہ لیکر آئے ہیں
ہائے ساون کی ہوا، ابرِ سیہ کا جھومنا	جیسے بادل دعوتِ خمخانہ لیکر آئے ہیں
دیکھتے ہی ان کو سب شکوے گلے جاتے رہے	کچھ عجب اندازِ معصومانہ لیکر آئے ہیں
جل نہ اٹھیں گرم آہوں سے نہیں وہ آسماں	سینے میں عشاق آتش خانہ لیکر آئے ہیں
آئے ہیں بہرِ عیادت ڈال کر منہ پر نقاب	آج بھی وہ نازِ معشوقانہ لیکر آئے ہیں
جی وطن میں بھی نہیں لگتا ہمارا اے شفیق
جب سے یادِ کوچۂ جانانہ لیکر آئے ہیں

جائے حسرت ہے کہ ہنس کر مرا رونا دیکھیں
جان سے جائے کوئی آپ تماشا دیکھیں

کون ملتا ہے انھیں چاہنے والا دیکھیں
خاک میں ہم کو ملانے کا نتیجا دیکھیں

آنکھ والے بتِ خود بیں کا کرشما دیکھیں
اور اللہ کی قدرت کا تماشا دیکھیں

یوں گذر جائے طوافِ درِ خوباں کرتے
کوے لیلیٰ سے اُٹھیں کوچۂ سلمےٰ دیکھیں

سجدے کرتا ہوا جاتا ہے صنم خانوں کو
کعبہ والے ترے عاشق کا سلیقا دیکھیں

یار و اغیار زمانے کی بہاریں لوٹیں
ہم اُسی سروِ خراماں کو ہمیشا دیکھیں

آئیں پامالیٔ عشاق پہ ہنسنے والے
بتِ مے نوش ترا جھوم کے چلنا دیکھیں

ہوں ترے حُسن خدا داد پہ سو جی سے نثار
گر تجھے مریمؑ و بلقیسؑ و زلیخا دیکھیں

رُخ سے تاریکیٔ عالم کو مٹانے والے
اپنے گھر میں کبھی ہم بھی تو اُجالا دیکھیں

ہائے مدّت ہوئی یارانِ چمن سے چھوٹے
کب گذرتا ہے یہ دوری کا زمانا دیکھیں

ہونٹ سی دیں اگر اُف تک بھی زباں سے نکلے
یہ نہ ہوگا کہ جہاں میں انھیں رسوا دیکھیں

ایسی صورت پہ کسے پیار نہ آجائے گا
آپ آئینے میں اپنا رُخِ زیبا دیکھیں

کیا قیامت ہے کہ موت آئے مریضِ غم کو
آپ بیٹھے ہوئے بالیں پہ تماشا دیکھیں

اپنے گھر میں نہ سہی غیر کی محفل میں شفیق
وہ جہاں ہوں انھیں ہر حال میں اچھا دیکھیں

تم سے سازش کرچکا ہے یہ کہاں سمجھا تھا میں
میری نادانی کہ دل کو رازداں سمجھا تھا میں
خانۂ اُمید کو جنّت نشاں سمجھا تھا میں
یاد آیا میکہ تم کو مہرباں سمجھا تھا میں

کیا اُمید افزا تھا راہِ عاشقی کا حوصلہ
ہر بگولے کو غبارِ کارواں سمجھا تھا میں

ایک دفتر بن گئی وہ سرگذشتِ آرزو
جس کو اک چھوٹی سی اپنی داستاں سمجھا تھا میں

تُو وہی منزل ہوئی ہے منزلِ مقصود اب
آج تک جس کو مقامِ امتحاں سمجھا تھا میں

اللہ اللہ اب وہ دل ہے ان کی نظروں میں عزیز
جس کو اپنی ہی طرح بے خانماں سمجھا تھا میں

میری پستی ہے مری ناخود شناسی کا اثر
ہائے کیوں اپنے کو رسوائے جہاں سمجھا تھا میں

اس نشیمن میں بلا کی بجلیاں خوابیدہ تھیں
ہمصفیرو جس کو اپنا آشیاں سمجھا تھا میں

میری صحت کی دعائیں اور وہ دستِ نازنیں
آہ جس کو بہرِ قتلِ عاشقاں سمجھا تھا میں

منفعل ہوں اب عنایاتِ مسلسل کی قسم
کیوں تمھیں غارت گرِ ایمان وجاں سمجھا تھا میں

آشیانہ ہی رہا باقی نہ شاخِ آشیاں
تھا عدوئے باغ جس کو باغباں سمجھا تھا میں

کھل گیا چشمِ تعمق میں یہ رازِ شمع و گل
ان کے جلوے کو جمالِ دگیراں سمجھا تھا میں

تجھ میں یہ افسردگی پیدا ہوئی کیونکر شفیق
تجکو میرِ انقلاب اے نکتہ داں سمجھا تھا میں

جب سے ساقی نہیں لطف ابرِ بہاراں میں نہیں
زندگی، زندہ دلی حلقۂ زنداں میں نہیں

خاکِ فرہاد کے ذرّے نہ غبارِ مجنوں
اگلے آثار کہیں کوہ و بیاباں میں نہیں

رہ گئے سبحۂ و زنار کے جھگڑے باقی
دھرم ہندو میں نہیں، دین مسلماں میں نہیں

خوب ہوتا اگر اس بت میں وفا بھی ہوتی
اک یہی چیز تو غارت گرِ ایماں میں نہیں

مرضیٔ دوست پہ موقوف ہے جینا مرنا
زندگی بس میں نہیں، موت بھی امکاں میں نہیں

یادِ گیسوئے حبیب آئی ہے کس دھوم کیساتھ
ایک تارا بھی فلک پر شبِ ہجراں میں نہیں

ہم تمنائے ملاقات کئے جائیں گے
آپ سو مرتبہ کہئے مرے امکاں میں نہیں

دل کا آرام، طبیعت کا سکوں، یکسوئی،
بخدا کون سی راحت ہے جو زنداں میں نہیں

آؤ داغِ دلِ مضطر کی بہاریں دیکھو
اس میں وہ پھول کھلا ہے جو گلستاں میں نہیں

دلِ آوارہ کا کچھ حال نہ معلوم ہوا
جب سے وہ خاک بسر کوچۂ جاناں میں نہیں

بلبلیں بھول گئیں اپنے ترانوں کو شفیق
ہم چلے آئے تو رونق بھی گلستاں میں نہیں

چمن سے قفس تک دھواں دیکھتا ہوں
نشیمن کی چنگاریاں دیکھتا ہوں

یہ محدود سی شے اور اتنی رسائی
عروجِ دلِ ناتواں دیکھتا ہوں

تری عظمتِ کبریائی کے آگے
خودی کو بھی سجدہ کناں دیکھتا ہوں

محبت نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا
اسے حاصلِ دوجہاں دیکھتا ہوں

جہاں حسن کی بے نیازی بھی گم ہے — وہاں عشق کو حکم راں دیکھتا ہوں
ہے اوج آدم کہ نقشِ قدم پر — فرشتوں کی پیشانیاں دیکھتا ہوں
جہاں طائرِ سدرہ اڑ کر نہ پہنچے — قلندر کی منزل، وہاں دیکھتا ہوں
وہ میری محبت سے راضی نہیں کیا — کہ ہر سعی کو رائگاں دیکھتا ہوں

شفیق سخنور جو ننگِ وطن تھا
اسے فخرِ ہندوستاں دیکھتا ہوں

ہر جادۂ عمل کو اک کہکشاں بناؤ — خورشید کے علم کو قومی نشاں بناؤ
لوٹے ہوئے چمن کو جنت نشاں بناؤ — ہندوستاں کو پھر سے ہندوستاں بناؤ
حیراں ہوں ملائک نازاں ہو خالقیت — دونوں جہاں سے ہٹ کر خود اک جہاں بناؤ
اب دستِ غیر پہ تم بیعت سے ہاتھ اٹھا لو — رندوں ہی میں کسی کو پیرِ مغاں بناؤ
گل بوٹے، چاند، سورج فرسودہ ہو چکے ہیں — تم خود زمیں بناؤ خود آسماں بناؤ
خطرے کی زندگی میں کب لطفِ زندگی ہے — جس میں خزاں نہ آئے وہ گلستاں بناؤ
بہرام چرخ کر دے قوسِ قزح کو صدقے — ارجن کو وجد آئے ایسی کماں بناؤ
اندیشۂ سفر سے پژمردگی کہاں تک — اے مغنیانِ ملت دل کو جواں بناؤ

اُجاڑے گی بھلا وہ قوم انسانوں کے مسکن کو
جو دے ترجیح خیمے پر کبوتر کے نشیمن کو

جہاں میں جینے والے موت کی باتیں نہیں کرتے
نہ چھیڑ اے زندہ شاعر داستانِ نقشِ مدفن کو

خدا حافظ ہر اک نقشِ قدم آنکھیں دکھاتا ہے
سنا ہے کارواں رہبر بنا بیٹھا ہے رہزن کو

غمِ صیاد، خوفِ باغباں، اندیشہ، گل چیں
سلام ایسی بہار، ایسے چمن، ایسے نشیمن کو

بنے گا وقت پر اب برق خاطف خود بھی ہر تنکا
کہ پہچانا ہے دہقاں نے مزاجِ برقِ خرمن کو

اُجالا صبحِ نو کا یہ پیامِ تازہ لایا ہے
کہ چاہو تو خزاں میں بھی سجا سکتے ہو گلشن کو

گئے وہ دن کہ جب جیب و گریباں چاک ہوتا تھا
کہ اب دیوانے نوکِ خار سے سی لیں گے دامن کو

ہماری جنگ میں بھی دوستی کی شان ہوتی ہے
کہ زخمی ہو تو خیمے میں اُٹھا لاتے ہیں دشمن کو

دور دنیا سے نظامِ جبر و استبداد ہو — خاک ہو راون کا گھر، سیتا کا دیس آباد ہو
سینہ کوبی نوحہ و ماتم کے آنسو تا کجا — آؤ گنگا کے کنارے جشن رکنا باد ہو
میں بھی اک بڑھتا ہوا سیلاب بنجاؤنگا آج — کیوں فریبِ آشیاں طوفانِ برق و باد ہو
خار گل بن جائیں، صحرا سے اُگیں سبزے اگر — دل بہار آگاہ ہو فطرت گلستاں زاد ہو
ناشناسِ جلوہ ہیں نظریں تو پھر کیسی بہار — فصلِ گل آیا کرے، گلشن ہزار آباد ہو

ہے سرِ شام کوئی ماہ جبیں آنے کو — چاندنی رات مبارک کرے خمخانے کو
غیر آباد کریں کیوں مرے میخانے کو — توڑیئے شیشہ، پٹک دیجیئے پیمانے کو
کام لیں اہلِ چمن غیرت خودداری سے — خود بہار آئیگی قدموں سے لپٹ جانے کو
میری تاریخ ہے پیغامِ حیاتِ ابدی — خلق دہرائیگی برسوں مرے افسانے کو
بے رُخی اہلِ گلستاں کی نہ بھولیگی کبھی — کیوں ہمیں یادِ چمن آئی ہے سمجھانے کو
تا درِ باغ بھی آیا نہ کوئی ہم جو چلے — بوئے گل چند قدم آئی تھی پہنچانے کو
اپنے جلوؤں سے بسانا نہیں منظور اگر — کیوں نہ تم آگ لگا دو مرے ویرانے کو
نازِ محبوب کو اللہ سلامت رکھے — کون آتا دلِ بیتاب کے بہلانے کو

بہی آزردگیٔ اہلِ وطن ہے تو شفیق
چل کے آباد کریں گے کسی ویرانے کو

کیا تیری کشش نے بے نیاز رہنما مجھکو
جو منزل ہے تو مل جائیگا منزل کا پتا مجھکو

دلِ وحشی بنا صحرا نیا میدان پیدا کر
کہ نا کافی ہے اب وسعتِ ارض و سما مجھکو

مبادا اُن کے نازِ خود پسندی پر گراں گذرے
[illegible] عاشقی کا ادعا مجھکو

جنوں ہے اور یکسوئی کسی کی یاد میں ہوں
[illegible] محبوب ہے ویرانۂ غم کی فضا مجھکو

ظہورِ حسن تو بس اللہ رے نازِ وحدت آرائی
بنا ڈالا ہے اپنا آئینہ سر تا پا مجھکو

سلام اے میری ہستی کو بلندی بخشنے والے
ترے در کی غلامی نے بہت اونچا کیا مجھکو

بنا لیتا نہ جانے کرسی و لوح و قلم کتنے
اگر معلوم ہوتا کاش اپنا مرتبا مجھکو

زمانے میں وفا کا نام زندہ کر دیا میں نے
ابھی تک حسرتِ جانانہ دیتی ہے دعا مجھکو

خدا کی شان ہے وہ میری بیہوشی پہ ہنستے ہیں
اور اب بیٹھے ہوئے دیتے ہیں دامن کی ہوا مجھکو

کہا کرتا ہے میرے بعد کوئی کتنی حسرت سے
کہ اکثر یاد آتا ہے شفیقِ باوفا مجھکو

قفس کی سب تیلیاں جلا دو گذر گیا قید کا زمانہ
وہ کس مپرسی کے دن گئے اب کہ پھونک دیتے تھے آشیانہ

ہمارے صحنِ چمن میں کوئی ذرا اب آئے تو غاصبانہ
نسیم مارے گی منہ پہ جھولیں بنے گی ہر شاخ تازیانہ

عجیب حسرت سے ان کا کہنا یہ آ کے نزدیک آستانہ
گلی میں چکر لگاؤ گے تم تو کیا کہے گا تجھے زمانہ
خوشی کے لمحوں کا پوچھنا کیا یہ غم کے لمحے بھی ہیں غنیمت
گیا ہوا دن نہیں پلٹتا ہزار گردش کرے زمانہ
ابھی تو نقش قدم بھی تیرے مٹے نہ ہوں شاید اے جوانی
جو یاد کرتا ہوں اگلی راتیں تو جیسے اک خواب یا فسانہ

جس دن سے بنایا مجھے تیر دل کا نشانہ — آیا نہ کبھی پھر وہ جفاؤں میں یگانہ
آئی تو مصیبت کی گھڑی حشر کا دن تھی — گذرا تو گھڑی بھر تھا سو سال کا زمانہ
اس وقت جدھر جاؤ زمانے کی زباں پہ — میری ہی کہانی ہے تمہارا ہی فسانہ
جب اُن کو بلاتا ہوں چلے آتے ہیں لیے عذر — کرتے ہیں کسی بات کا حیلہ نہ بہانہ
آیا ہے شباب اُن پہ متانت کی ادا سے — جیسے کہ دبے پاؤں قیامت کا زمانہ
ہر چند کہ اُجڑا ہوا گھر ہے دل ویران — چاہو تو بنا جاؤ اسے آئینہ خانہ
کیا پوچھتے ہو تم کسی مہجور کا عالم
اس درد سے روتا ہے کہ روتا ہے زمانہ

خاکساروں کی بصیرت واہ واہ — فرش سے تا عرش ہے زیر نگاہ

اللہ اللہ فیضِ پیرِ میکدہ — لی حرم والوں نے میخانے کی راہ
وائے بیدردی کہ گل ہیں خندہ زن — نکہتِ برباد پھرتی ہے تباہ
ہو رہا ہے کس کا انکارِ وجود — جس کی ہستی پر ہے ہر ذرہ گواہ

عشق کی رسوائیوں نے اے شفیق
کر دیا ہے بے نیازِ عز و جاہ

چار دن کی زندگی میں حیف کیا کیا کیجئے
فکرِ دنیا کیجئے یا فکرِ عقبیٰ کیجئے

جی میں آتا ہے کہ اپنا آپ شکوہ کیجئے
آپ ہی اپنے کو دنیا بھر میں رسوا کیجئے

حضرتِ ناصح سر آنکھوں پر نصیحت آپ کی
جب طبیعت پر نہ قابو ہو تو پھر کیا کیجئے

بس تمنا ہے تو یہ ہے آرزو ہے تو یہ
سامنے بیٹھے رہیں وہ اور دیکھا کیجئے

تا بکے آخر کسی کوچے کا چکر اے شفیق
کہہ نہ دے کوئی مرے در پہ نہ آیا کیجئے

برابر مطربِ بزمِ ازل مستِ ترنّم ہے
مگر ہستی کے ہنگاموں میں نغموں کی صدا گم ہے

عجب پُر لُطف دریائے محبّت کا تلاطم ہے
یہ موجوں کا تصادم ہے کہ آوازِ ترنّم ہے

تجلّی گاہ میں ان کی پہونچ کر دل پکار اٹھا
تم ہی تم ہو مری ہستی تو ہم ہی تو ہم ہے

بہار آئی ہے میخانہ بھی ہے آراستہ لیکن
نہ وہ محفل نہ وہ ساقی نہ وہ ساغر نہ وہ خم ہے

وہی اس گلشنِ ایجاد میں ہنگامہ آرا ہیں
نہ بلبل کا ترنّم ہے نہ پھولوں کا تبسّم ہے

شفیق اس وقت کیا آئے ہیں وہ میری عیادت کو
کہ نظّارے کی طاقت ہے نہ اب تابِ تکلّم ہے

جو یاد آتی ہیں ہم کو داستانیں عہدِ اوّل کی
تو یہ معلوم ہوتا ہے یہ باتیں ہیں ابھی کل کی
کسی کو دیکھ کر ناگاہ کوئی ہوش کھوتا ہے
کوئی زانوں پہ سر رکھ کر ہوا دیتا ہے آنچل کی

پلائی ہے جو خود ساقی نے دستِ ناز سے اپنے
تو اک چلو میں کیفیت ہوئی ہے ایک بوتل کی

فقط مضمونِ اُلفت جان ہے اپنے فسانے کی
اِسی سے داستانِ زندگی ہم نے مکمل کی

تمہارے ہجر میں کچھ کھا کے آخر جان دے بیٹھا
شفیق مبتلا نے اپنی مشکل آپ ہی حل کی

گلے مل مل کے روتی ہے وفا شوق و تمنا سے
کہ رخصت ہو رہا ہے آپ کا بیمار دنیا سے

نہیں وہ تیرے ہی دیوانے کی میت نہ ہو ظالم
اُٹھا کر لوگ لائے ہیں کسی کی نعش صحرا سے

ارے او اپنے جلوے کا تماشا دیکھنے والے
قیامت ہو نہ برپا تیرے حُسنِ آشکارا سے

یہ شانِ حُسن ہے تیری تو پھر بیکار ہے پردہ
کہ جلوے پھوٹ نکلے ہیں نقابِ روئے زیبا سے

محب محبوب سے مل کر محب باقی نہیں رہتا
کہ بن جاتا ہے قطرہ خود بھی دریا مل کے دریا سے

محبت کی وساطت سے قریبِ یار جا پہونچے
ملائے حدِ اوسط جس طرح صغرا کو کبرے سے
مسلمانوں کو اب تک خانہ جنگی سے نہیں فرصت
شفیق اغیار کو دیکھو کہ وہ کیا ہو گئے کیا سے

نہ گردوں سے توقع ہے کہ گھر آباد رہنے دے
نہ قسمت پہ بھروسہ ہے کہ مجکو شاد رہنے دے
اگر سچ ہے تو یہ بھی اک خدا کی شان ہے ورنہ
وہ کافر اور اپنے دل میں میری یاد رہنے دے
جو اے صیّاد میری زندگی منظور ہے تجھ کو
تو جب تک موسمِ گل ہے مجھے آزاد رہنے دے
شبِ غم کاش یہ آکر کوئی کہتا سرِ بالیں
کہ اُٹھ ہم آگئے اب نالۂ و فریاد رہنے دے
جنوں کی رائے کچھ ہے عقل کی فہمائشیں کچھ ہیں
نہ وہ آباد رہتے نہ یہ برباد رہنے دے
طریقہ شاد کرنے کا تو سیکھا ہی نہیں تو نے
یہی احسان ہے تیرا اگر ناشاد رہنے دے

مزا ملتا ہے عاشق کی تباہی میں تو ہاں یونہی
شفیقِ خانما برباد کو برباد رہنے دے

اہلِ نظر کے واسطے جلوہ بے حساب ہے
منظرِ شہرِ دلربا قابلِ انتخاب ہے
روکشِ ماہتاب ہے غیرتِ آفتاب ہے
وہ صنمِ خدا نما حُسن میں لاجواب ہے
قسمتِ دل چمک گئی خاک ہے کوئے یار کی
عشق میں جو خراب ہے اور بھی کامیاب ہے
وجد میں ہیں طبیعتیں رقص میں ہیں مسرتیں
ایک تمہی شباب ہے چاروں طرف شباب ہے
یوں تو ہر ایک تذکرہ سوز و گداز کی ہے رُوح
جانِ کتابِ عاشقی میری وفا کا باب ہے
طرفہ حیات ہے شفیق عشق و جنوں کی زندگی
کانٹوں کے فرش پر مجھے لذتِ عیش خواب ہے

پی لیں کہ جوانی ہی میں پینے کا مزا ہے
اے شیخ حرم توبہ کا دروازہ کھُلا ہے
پھر شامِ جُدائی کا خدا منہ نہ دکھلائے
آفت ہے قیامت ہے مصیبت ہے بلا ہے
پروانہ جلے نالہ کرے بلبلِ شیدا
اے عشق یہی حُسن پرستی کا صلا ہے
پہونچا ہے کہاں سلسلۂ بادہ پرستی
لینے مرے ساقی کا لقب نسبتِ خدا ہے
فریاد شفیق آپ جگر تھام کے سُنئے
تڑپائے ہوئے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے

مقتلِ عشق میں پوچھو نہ وفا داروں کی
سجدے ہوتے ہیں جہاں چھاؤں میں تلواروں کی

زلف بکھرائے ہوئے ناز سے چلنے والے
کچھ خبر بھی ہے تجھے اپنے گرفتاروں کی

مرشدِ خانقہ و بیمہ و حرم مفتی شہر
سب سے ہے راہ جُدا اُن کے پرستاروں کی

اُس کی بخشش کی ہے وہ دھوم کہ شیخ وزاہد
سب چلے آتے ہیں صورت میں گنہ گاروں کی

مجھ جگر سوختہ پر بھی ہو نوازش کی نگاہ
خیریت پوچھنے والے جگر افگاروں کی

طلبی آج اُسی بارگہہ خاص میں ہے
دل نوازی کو شفیق آپ سے بے یاروں کی

دکھاتا ہے مری کشتی کو مشقِ رہگری اپنی
بس اک طوفان آجاتا تو منزل ختم تھی اپنی

اب اُن کی بزم میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی
وہ خود روتے ہیں پہروں یاد کر کے بے رخی اپنی

تمہیں بھی یاد ہے وہ ابتدائی سادگی اپنی
کہ آئینہ اٹھایا اور صورت دیکھ لی اپنی

نظارا اگر نہیں مشتاق نظروں کے مقدر میں
سُنا دو کاش پردے سے کبھی آواز ہی اپنی

چمن میں احترامِ غیر کیسا اب تو پھولوں سے
بہار آئی ہے تو رُکی نہیں جاتی ہنسی اپنی

گذارا دل نے دورِ عاشقی کتنی متانت سے
نہ بدنامی ہوئی ان کی نہ رسوائی ہوئی اپنی

بنایا ہے ہمیں اک ہستیٔ مجبور قدرت نے
نہ اپنی زندگی اپنی نہ اپنی موت ہی اپنی

لب جو رات جیسے ہر طرف حسرت برستی تھی
بہت روئی کسی کو یاد کر کے بیکسی اپنی

اندھیری رات سونی ہے سحر سونی ہے، دن سونا
بس اک تم ہم سے کیا چھوٹے کہ دنیا لٹ گئی اپنی

غبارِ راہ بھی اب تو چھپا جاتا ہے نظروں سے
سحر کو رو بیٹھے۔ شام بھی برباد کی اپنی

غلط ہے اعتمادِ غیر پہ فریاد کی عادت
خود اپنا [illegible]

عبث ہے بادہ نوشو میکدے پر اعتماد اپنا
کہ ساقی خود بجھا سکتا نہیں اب تشنگی اپنی

ہمیں ہنگامۂ عالم سے کیا مطلب یہ حسرت ہے
کہ ان کی یاد سے ہوتی رہے دل بستگی اپنی

فقط ساقی ہی سے ایثار کی اُمید کیا معنے
دکھاتا پینے والا بھی تو کچھ دریا دلی اپنی

شفیق آرام سے تنہا اگر گذری تو کیا حاصل
ضرورت ہے کسی کے کام آئے زندگی اپنی

دنیا سے جُداگانہ ہم رندوں کی محفل ہے
ہر قسم کی آزادی تہذیب میں داخل ہے

شوریدہ مزاجوں کو تخصیص وطن کیسی
جس سمت نکل جائیں ان کی وہی منزل ہے

عبرت کا تماشا ہے انجام ستم کوشی
لیلےٰ ہے مگر کوئی بے ناقہ و محمل ہے

اب شمع عبث اپنی تنہائی پہ روتی ہے
پہلے ہی سمجھنا تھا پروانوں سے محفل ہے

قیصر کی شہنشاہی کسرےٰ کی جہانگیری
اس در کے غلاموں کو اک سجدے میں حاصل ہے

خطرہ دام و قفس کیوں دلِ ناشاد رہے
آج یا ہم رہیں یا خانۂ صیاد رہے

اُٹھ گئی قدر زمانے سے وفاداری کی
وہ ہمیں یاد رہا، ہم نہ اُسے یاد رہے

ہم کو تو ٹوٹے ہوئے دل کی تمنّا تھی مگر
خانۂ دل تری منزل ہے تو آباد رہے

رحم گلچیں کے سہارے پہ گذارا کب تک
چمنِ دہر میں جینا ہے تو آزاد رہے

کچھ نہیں اس کے سوا اور تمنّائے شفیق
تیری گلیوں میں رہے چاہے وہ برباد رہے

مجھے کیا ہو خوشی گر موسمِ گل کا زمانہ ہے
نہ اب میرا گلستاں ہے نہ میرا آشیانہ ہے

ترقی جسکو کہتے ہیں مرا اگلا فسانہ ہے
تنزل جسکو کہتے ہیں وہ اب میرا زمانہ ہے

تمھارا حسن لاثانی ہے یکتا ہے یگانہ ہے
خدا رکھے تمھیں تم ہو تمھارا ہی زمانہ ہے

مجھے کیوں فکر ہو دشمن اگر سارا زمانہ ہے
کہ اب تو میرا سر ہے اور تیرا آستانہ ہے

کوئی نہ کہہ چمن کرتا ہوا اک روز گذرا تھا
اُسی دن سے گرفتارِ قفس اب وہ دوانہ ہے

کبھی بدنامیوں کو رو رہی تھی عشق کی غیرت
خدا کی شان ہے اب حُسن رسوائے زمانہ ہے

پریشان زلف ہے مغموم چہرہ اشکبار آنکھیں
یہ کیوں معشوق ہو کر ان کی صورت عاشقانہ ہے

نہ پوچھیں مفتیانِ شہر وجہ رندی و مستی
مرا یہ عذر کیا کم ہے جوانی کا زمانہ ہے

مری آسائشوں کا پاس ہے صیاد کو لیکن
قفس پھر بھی قفس ہے آشیانہ آشیانہ ہے

نہیں ہے حشر میں بھی کوئی پرسانِ داد خواہوں کا
یہاں بھی جس طرف وہ ہیں اُدھر سارا زمانہ ہے

ادھر اصرار پر اصرار ہے پردہ اٹھانے کا
ادھر ان کی زباں پر لن ترانی کا ترانہ ہے

شفیقِ باوفا نے آج تک دیکھا نہیں اُنکو
نہ جانے کیوں اُسے اُن کی محبت غائبانہ ہے

پاس رکھا ہے نہ دامن نہ گریباں ہم نے
خاک صحرا تجھے سونپا تنِ عریاں ہم نے

اپنے چھوٹے سے نشیمن کو سجایا کیسا
پھول چن چن کے بنایا ہے گلستاں ہم نے

پاس کیا شے ہے اب اندیشۂ حرماں کیسا
کس کی سرکار میں پھیلایا ہے داماں ہم نے

زندہ کرنے کے لئے کوہکن و قیس کا نام
پھر سے آباد کیا کوہ و بیاباں ہم نے

داد دے اے فلک اس بیکسی و حسرت کی
فصل گل آتے ہی چھوڑا ہے گلستاں ہم نے

اک تری یاد نے کونین سے بیگانہ کیا
سب سے منہ پھیر لیا اے شہ خوباں ہم نے

جذب پنہاں کو ہے دعوا کہ انھیں ہم لائے
نالے کہتے ہیں کیا کار نمایاں ہم نے

روح کو چین نہیں قلب کو آرام نہیں
جب سے چھوڑا تجھے اے کوچہ جاناں ہم نے

کیوں ہمارے ہی نشیمن پہ ستم ہوتا ہے
چمنستاں کو بنایا چمنستاں ہم نے

ہو گیا تھا کبھی نظارۂ بلبوس حبیب
پھر تو سمجھا نہ گریباں کو گریباں ہم نے

اُن کے جاتے ہی خوشی چھن گئی قسمت سے شفیق
پھر نہ دیکھا دلِ مجبور کو شاداں ہم نے

سلام اے خوش جمال و خوش ادا و جانِ محبوبی
بہارِ باغِ خوبی، رونقِ بستانِ محبوبی

خدارا او بتِ کافر دکھا جا شانِ محبوبی
غبارِ راہ ہیں برسوں سے مشتاقانِ محبوبی

کہوں لیلائے خوبی تجکو یا سلمائے مطلوبی
پکاروں میں تجھے کس نام سے اے جانِ محبوبی

ترے ہی واسطے تخلیق فرمائی ہے قدرت نے
بہارِ دل بری، صبحِ جوانی، شانِ محبوبی

پکار اُٹھتے ہیں تیری راہ میں حسرت بھرے دل والے
کہ اے سروِ خراماں آ بصد عنوانِ محبوبی

زہے نورِ جبیں، حسنِ تبسم، نکہتِ گیسو
مبارک اے جمال آرا تجھے سامانِ محبوبی

کدھر سے آرہی ہے تیری بوئے جانفزا پیہم
قرارِ عاشقاں اے یوسفِ کنعانِ محبوبی

شباب آنے سے پہلے ہی قیامت آفریں نکلا
کسی کا قامتِ موزوں کہ ہے شایانِ محبوبی

وفا ہو یا جفا ہو یا تغافل کی روش کچھ ہو
شفیق اس دل ربا کی ہر ادا ہے جانِ محبوبی

داغِ حرم و دیر جبیں پر نہیں رکھتے
اس دو کے سوا اور کہیں سر نہیں رکھتے

یہ سوچ کے اُن کا نہ نشانِ کفِ پا ہو
ہم پاؤں کسی نقش قدم پر نہیں رکھتے

اللہ رے حیا دیکھ کے پروانوں کی کثرت
وہ شمع قریبِ رُخِ انور نہیں رکھتے

سُن کر ترے الطاف کی دھوم آئے ہیں ساقی
ہم قیمتِ پیمانہ و ساغر نہیں رکھتے

کیوں تشنہ لبی کا ہو گلا مجکو شفیقی
کیا مجھ پہ نظر ساقیٔ کوثر نہیں رکھتے

عجب پُر کیف ہوتے ہیں شب زنداں کے افسانے
جہاں زنجیر کی جھنکار پر گاتے ہیں دیوانے

مُبصر ہو تو آ ہوئے حرم کی قدر پہچانے
جو کہتی ہے کسی کے نرگسِ خود بیں کے افسانے

وہ آئے ہیں تو قدموں پہ جھکے پڑتے ہیں دیوانے
بلا تشبیہ جیسے شمع پر گرتے ہیں پروانے

بنائیں گے ہر اک گھر کو تری اُلفت کا کاشانہ
کلیساؤں کو ڈھائیں گے نہ ہم توڑیں گے بتخانے

حسیں آنکھوں کا دیوانہ، بکارِ خویش فرزانہ
چلا ہے پھر انھیں گلیوں کی جانب دل کو بہلانے

وہ اُن کی بے رُخی پر عشق کا احساس خود داری
تمنّاؤں کا یہ عالم نظر مانے نہ دل مانے

انوکھا ہے ترے رندوں کا بھی انداز اے ساقی
کہ داناؤں میں دانا ہیں تو دیوانوں میں دیوانے

پسند آیا نہ غیروں کا تصرف بزم میں اپنی
تو خود محفل سجا کر توڑ ڈالے ہم نے پیمانے

سنبھل تو بھی کہاں تک بجلیوں کا خوف اے دہقاں
لپٹ جائیں شراروں کی طرح خرمن کے سب دانے

نہ ہمت پست کر تعمیر نو کی سعی کرتا جا
ارادوں کی توانائی بسا دیتی ہے ویرانے

ہے کیا جبرئیل کے تلوؤں کو نازِ چشمۂ زمزم
مرے قدموں کی ٹھوکر سے اُبل پڑتے ہیں میخانے

زمانہ بر سرِ تخریب ہے لیکن شفیقؔ آخر
مرتب کر رہی ہیں زندہ قومیں اپنے افسانے

نہ گھبرا اے اسیر آتی ہیں راتیں شادمانی کی
خوشی کی نیند ہو گی کروٹیں ہوں گی جوانی کی

اُسی نے آگے چل کر دہوم سے کشور ستانی کی
چرا گاہوں میں جس نے بکریوں کی گلہ بانی کی

خزاں بھی فصلِ گل بن جائے سوزِ عشق اگر چاہے
کہ جس نے آتشِ نمرود میں بھی باغبانی کی

ادھر آئیں کہاں ہیں حاملانِ سدرۂ و طوبےٰ
کہ مُرغانِ حرم کو دھمکیاں ہیں بے زبانی کی

اب اس کے پاؤں تھرّاتے ہیں حُرّیت کی منزل میں
کہ جس نے ٹھوکروں نے جڑ ہلادی حُکمرانوں کی

سفینہ آچکا ہے سیکڑوں موجوں کی زد میں جب
تو سوجھی ہے ہمارے ناخُدا کو بادبانی کی

ہیں پیہم ساڑھے تیرہ سو برس کے زلزلے شاہد
کہ اے اسلام تونے آپ اپنی پاسبانی کی

ذرا دیکھوں گا میں بھی آفتابِ حشر کی گرمی
مرے سینے میں بھی اک آگ ہے سوزِ نہانی کی

صداقت اس کو کہتے ہیں کہ مرکز ہل گیا جن سے
انھیں تاتاریوں نے خود حرم کی پاسبانی کی

نکالا خود مجھے اسپین سے لیکن مرے غم میں
کلیسا کے نگہبانوں نے برسوں نوحہ خوانی کی

دئے اغیار کو تم نے تو کی اعدا کی جاں بخشی
خصوصیات ہیں یہ میرے عہدِ حکمرانی کی

سلامِ ملک و ملت تا قیامت اس مجاہد پر
کہ جس نے کاٹ دیں زنداں میں راتیں نوحہ خوانی کی

حبیب ابن مظاہر اور عاشورے کی قربانی
مجاہد کو نہیں ہوتی شکایت ناتوانی کی

معطر ہو گئی بیرِ علم پر چاک دامانی
یہ وہ منزل ہے خوشبو ہے جہاں بردِ یمانی کی

نہ گھبراؤ شفیقی عہدِ حاضر کی کشاکش سے
کہ اک تمہید ہے یہ آنے والی زندگانی کی

نہ پوچھو کس درِ عالی پہ سر جھکا آئے
گناہگار گئے اور بے خطا آئے

کمی نہیں تری درگاہ میں مگر یہ سچ ہے
کہ تجھ سے مانگنے والے کو مانگنا آئے

غضب بھی ہو تو بدل جائے شانِ رحمت سے
تجھی کو جب ترا مجرم پکارتا آئے

نکل پڑوں جو ترا نام لیکے آج بھی میں
ہر ایک گام پہ آوازِ مرحبا آئے

وہ دن بھی تھا کہ نہ مسند نہ تاج و تخت مگر
جہاں گئے ترے بندے زمیں ہلا آئے

ملا تھا علمِ ازل میں صفات و اسما کا
نہ جانے بھولنے والے کہاں بھلا آئے

تھا اُن کی نیند میں بھی اے شفیق اک درسِ بیداری
جنھیں سوتے ہوئے دیکھا تھا فرشِ خاک پر میں نے

اُف وہ نگاہِ مست جو کیف آفریں ہوئی
پھر اس طرح کی بادہ پرستی نہیں ہوئی

شام آئی اور یاد تری دل نشیں ہوئی
پھر کیا خبر کہ صبح ہوئی یا نہیں ہوئی

مدت سے شرح ہوتی ہے اک لفظِ عشق کی
اب تک یہ داستان مکمل نہیں ہوئی

وہ آخری سلام، وہ پردے کی جنبشیں
جیسے کہ ہر نگہ نگہِ واپسیں ہوئی

کیا ہوگئی وہ میری چمن سازِ زندگی
آئی خزاں بھی گر تو بہار آفریں ہوئی

اے چرخ اپنی خاک بھی برباد ہو چکی
پوری تری مراد ہوئی یا نہیں ہوئی

کی جب سے تو نے راہ کی تخصیص راہ رو
اس دن سے تجھ پہ تنگ خدا کی زمیں ہوئی

چمکی فلک پہ شمس و قمر میں بہارِ دوست
اتری زمین پر تو گل و یاسمیں ہوئی

تھی بیخودی میں بھی رُخِ ساقی ہی پر نظر
بہکے مگر نگاہ کو لغزش نہیں ہوئی

ہر شے پہ ہے شباب تمھارے شباب سے
تم کیا حسیں ہوئے کہ خدائی حسیں ہوئی

قدموں پہ جھک رہی ہیں شفیق اب بلندیاں
کس در پہ سرفراز ہماری جبیں ہوئی

اس ستمگر کی جفا دیکھئے کیا کرتی ہے
پھر مری آہِ رسا دیکھئے کیا کرتی ہے

کتنی مشکل سے بھلایا تھا غمِ ساقی کو
ہائے ساون کی گھٹا دیکھئے کیا کرتی ہے

شوخیٔ شوق تو مسرور ہے تنہائی پر
اُن کی آنکھوں کی حیا دیکھئے کیا کرتی ہے

لے کے جاتی تو ہے پیغامِ محبت لیکن
اب وہاں جا کے صبا دیکھئے کیا کرتی ہے

چرخ تھرّائے، زمیں کانپ اُٹھے، عرش ہلے
کسی بیکس کی دُعا دیکھئے کیا کرتی ہے

آپ تو دیکھ چکے اپنے ستم کا انجام
اب مری شانِ وفا دیکھئے کیا کرتی ہے

برق انگڑائیاں لیتی ہے خدا خیر کرے
آشیانے کی بنا دیکھئے کیا کرتی ہے

اے شفیق آہ پریشاں ہیں مرغانِ حرم
یہ کلیسا کی ہوا دیکھئے کیا کرتی ہے

خوشی کے ساتھ رہیں کیوں نہ تلخیاں غم کی
تضاد ہی پہ بنا ہے تمام عالم کی

وہ قد مثال ہے اک جلوۂ مجسم کی
کہ جس میں جذب ہے ساری بہار عالم کی

ہے اب خوشی میں بھی راحت الم میں بھی راحت
خدا دراز کرے زندگی ترے غم کی

نہ کیوں ہو حاصلِ لوح و قلم فسانۂ عشق
یہ اک لفظ حقیقت ہے سارے عالم کی

کھلا سجودِ ملائک سے رتبہ خاکی
کہ پستیوں میں بلندی ہے ابنِ آدم کی

وہ سجدے کرتا ہوا آرہا ہے دیوانہ
کہ حُسن کو بھی تمنّا ہے خیر مقدم کی

بشر کو چاہئے ہر لمحۂ قریب پہ غرور
کہ جو نفس ہے وہ منزل ہے سعیٔ پیہم کی

زہے وفا کہ ستمہائے دوست سے بھی ہوئیں
تسلیاں دلِ بیتاب وجان پہ غم کی

جو ہم نے بھی تمھیں چاہا تو کیا گناہ کیا
کہ ہیں تمھیں پہ نگاہیں تمام عالم کی

وہ اور ہیں جو فقط فصل گل میں پیتے ہیں
مرے لئے کہیں پابندیاں ہیں موسم کی

شفیق بجھ گئی یہ بات کہہ کے شمع سحر
ذرا سی صبح ہے تھوڑی سی عمر شبنم کی

فریادِ شبی ہے نہ فغانِ سحری ہے
اب میں ہوں اور اک قسم کی آشفتہ سری ہے

بیرحم کی آنکھوں میں کبھی اشکو ںکی تری ہے
کتنی مری فریاد کی لَے درد بھری ہے

بیخود ہوں مگر نام زباں پر ہے کسی کا — یہ بے خبری حاصلِ صد باخبری ہے

شاید وہ مرا حال کبھی پوچھیں تو پیامی — کہنا کہ ابھی تک وہی شوریدہ سری ہے

کیا اس سے زیادہ کہوں تعریف میں اُن کی — اک حُسنِ مجسم بہ لباسِ بشری ہے

کیوں اُن کی بہاروں کی گل و لالہ سے تعبیر — یہ دیکھنے والے کی پریشاں نظری ہے

کس جانِ گلستاں کی طرف ہے کششِ روح — جو سانس ہے رفتارِ نسیمِ سحری ہے

کہنا ہی پڑا ان کو یہ خط پڑھ کے ہمارا — کمبخت کی ہر بات محبت سے بھری ہے

صدقے ہو مرے درد پہ درمانِ مسیحاؑ — تو اور نمک پاشیٔ زخمِ جگری ہے

اک حال پہ رہتی ہے کہاں شاخِ تمنّا — سوکھی ہے تو سوکھی ہے ہری ہے تو ہری ہے

تاریک ہوئی جاتی ہے دنیائے محبّت — آجاؤ کہ بیمار چراغِ سحری ہے

جائیں تو کہاں جائیں کدھر جائیں شفیق آج

دنیا تو شر و کینہ و بدعت سے بھری ہے

نہ چھیڑ اے دوست اب مجکو اسی مشکل میں رہنے دے

نگاہ و دل کا افسانہ نگاہ و دل میں رہنے دے

ہٹا مطرب رباب اپنا۔ ہٹا ساقی مئے و مینا

نہیں ہیں وہ تو ہر بے رونقی محفل میں رہنے دے

اس اک بیکس کی بربادی پہ سو آبادیاں صدقے

خداوندا کہاں تک عشق کی تقسیم بیتابی
بس اب اس درد کو میرے ہی آب وگِل میں رہنے دے

تغیّر کی ضرورت ہے مگر ہو انقلاب ایسا
جو ماضی کے بھی کچھ آثار مستقبل میں رہنے دے

نہیں ایسے امیر کارواں پہ اعتماد اپنا
کہ جو ہم کو کسی محدود سی منزل میں رہنے دے

اٹھی جاتی ہے رسمِ پردہ داری حسن والوں کی
مگر شاعر کو ذکرِ ناقہ و محمل میں رہنے دے

ذرا باقی رہے چشمِ طلب کی آرزو مندی
نگاہِ شوق پہ پابندیاں محفل میں رہنے دے

مری دشواریوں پہ اے شفیقؔ آسانیاں صدقے
اگر مشکل کا خالق ہے مجھے مشکل میں رہنے دے

زاہد کبھی تکمیل مقامات نہ ہو گی — جب تک نظرِ پیرِ خرابات نہ ہو گی
مایوس نہیں ہوں کہ ملاقات نہ ہو گی — جاؤں گا تو پردے سے بھی کیا بات نہ ہو گی
وہ بھی جو مرے غم کی کہانی نہ سنیں گے — دنیا میں کہیں پرسشِ حالات نہ ہو گی
کیا بات ہے بندوں کی دعائے سحری کی — ایسی تو حرم میں بھی مناجات نہ ہو گی

ساقی ترا میخانہ تو آباد رہے گا　　لیکن جو ترے دم سے ہے یہ بات نہ ہوگی

سب بھیں یہ خرابات سے ساون کی بہاریں　　سُن لو کہ اب اُس دھوم سے برسات نہ ہوگی

میخانے کا رشتہ تھا فقط پیرِ مغاں سے　　اب میکدے والوں سے ملاقات نہ ہوگی

گل ہوں گے چمن ہوگا یہ جلسے بھی رہیں گے　　سب ہوں گے شفیق ایک مری ذات نہ ہوگی

دل سلیقے سے اگر عشق میں دیوانہ بنے　　ایک اک غنچہ و گل جلوۂ جانانہ بنے

ذرّہ ذرّہ ہے دلِ داد طلب کی تصویر　　عرصۂ حشر نہ یارب کہیں بتخانہ بنے

دیکھ واعظ نظرِ پیرِ خرابات کا فیض　　حضرتِ شیخ گدائے درِ میخانہ بنے

ہے یہی عہدِ جوانی کا مزا اے ناصح　　کوئی دیوانہ بنائے کوئی دیوانہ بنے

اللہ اللہ ترے رخسارِ مصفا کی ضیا　　شمع آئے تری محفل میں تو پروانہ بنے

خاک جینے پہ نہ ہو گر تپشِ عشق شفیق
دل وہی دل ہے کہ جو درد کا کاشانہ بنے

پیامِ زندگی اوبے خبر ذوقِ شہادت ہے　　مجاہد کیلئے تلوار کے سائے میں جنت ہے

بسی ہے تارِ تارِ پیرہن میں بوئے جانانہ　　یہ میرے حال پہ بادِ صبا تری عنایت ہے

کبھی وادی میں چشموں کے کنارے بیٹھ جاتا ہوں　　کبھی سوکھے ہوئے کانٹوں پہ میرِ عیش خواب راحت ہے

خطا میں بخشنے والے پہ میں قربان ہو جاؤں　　یہاں عصیاں ہی عصیاں ہیں وہاں رحمت ہی رحمت ہے

جب دوستی کی رسم اٹھتی ہے زمانے سے — تمہارا دردمندِ عشق بھی دنیا سے رخصت ہے
ترے مستوں کو اے ساقی غمِ دوراں سے کیا مطلب — جہاں دو گھونٹ پی فکرِ دو عالم سے فراغت ہے

شفیق ان کی نگاہِ لطف کا کیا ذکر کرتے ہو
کہ ان کے ہاتھ سے تکلیف بھی پہونچے تو راحت ہے

الفت کی بدنامی ہر وقت کی رسوائی — لیتے ہوئے اس دل کو قسمت بھی نہ شرمائی
ہر بزم میں کرتے ہیں وہ انجمن آرائی — لیکن مری محفل تک تکلیف نہ فرمائی
چھوٹے نہ دلِ مضطر دامانِ شکیبائی — اُن کی بھی ہے بدنامی اپنی بھی ہے رسوائی
یہ تو سزا ہی تھی رو رو کے سحر کرنا — سنتے ہیں کہ بستر پر ان کو بھی نہ نیند آئی
گر تجھکو پلانے سے انکار ہے اے ساقی — تو آج سے میں نے بھی پینے کی قسم کھائی
اے خانہ بر اندازی اے حسرتِ جانانہ — اس دل کو مٹا ڈالا جس دل میں جگہ پائی

وہ چاہیں تو مٹ جائے آزارِ شفیق اپنا
اُن سے تو مسیحا نے سیکھی ہے مسیحائی

کہتے ہو عشق تو میراث ہے پروانے کی — ہائے میرے لئے یہ بات ہے مرجانے کی
کس قدر عام ہے فیضانِ مئے ساقی کا — کوئی تخصیص ہے اپنے کی نہ بیگانے کی
بدلی جاتی ہیں تمہاری ہی نگاہیں اب تو — کیا شکایت ہو زمانے کے بدل جانے کی

ایک وحشت ہے جو ہر سمت لئے پھرتی ہے　　کون سی فکر کریں جی کے سنبھل جانے کی

جام ہو میکدۂ ساقیٔ بطحیٰ کا شفیق
صبح ہو حیدرؑ کرار کے میخانے کی

نہ کر سکے مئے و مینا گناہگار مجھے　　بنا گئیں وہی آنکھیں شراب خوار مجھے
تمھارے وعدے کا ہو جائے اعتبار مجھے　　تو ساری عمر گوارا ہے انتظار مجھے
یہ مستیاں ہیں تو جائیگا اب کے موسم گل　　بنا کے بادہ فروشوں کا قرضدار مجھے
سنا ہے حشر میں وہ بے نقاب نکلیں گے　　اسی لئے ہے قیامت کا انتظار مجھے
جو مٹ کے خاک نہ بن جاؤں آستانے کی　　تو پھر نہ آج سے کہنا وفا شعار مجھے
یہاں کچھ اور ہی معیار ہے مسرت کا　　تری خوشی ہے تو ہر غم ہے خوشگوار مجھے
رضائے دوست نے ذوقِ نظر بدل ڈالا　　خزاں میں بھی نظر آنے لگی بہار مجھے
متاعِ صبر و شکیب و سکوں مٹا آیا　　مِلا تمھاری راہ میں کوئی نقاب دار مجھے

شفیق جس کی محبت نے خاک کر ڈالا
وہ عاشقوں میں بھی کرتا نہیں شمار مجھے

نہ ہوتا رنگِ معصومی نہ اتنی دل نشیں ہوتی
وہ چاہے آپ کی تصویر کتنی ہی حسیں ہوتی

فضا بھی اے نواسنجو محبت آفریں ہوتی
فقط گلشن کی رونق آشیانوں سے نہیں ہوتی

چمن کے حال پر اب کے برس خود رو دیا گلچیں
کہ ہوتی ہے مگر ایسی بھی بربادی نہیں ہوتی

ہمیں سے رونقِ بت خانہ بھی شانِ حرم بھی ہے
نہ ہم ہوتے زمانے میں نہ بحثِ کفر و دیں ہوتی

قدح نوشی تو کیا اک موج ہے اپنی فقیرانہ
کبھی دن رات ہوتی ہے کبھی برسوں نہیں ہوتی

زمانے کے مذاق ناشناسی سے خُدا سمجھے
وفا سی شے اور اس کی قدر دنیا میں نہیں ہوتی

مری دیوانگی پر ہنسنے والے دیکھتے اُن کو،
تو دامن کی خبر ہوتی نہ فکرِ آستیں ہوتی

غریبوں کے خدا برباد کر دے ایسی دنیا کو
جہاں مظلوم کے نالوں کی شنوائی نہیں ہوتی

شفیقی چاندنی راتوں میں جب تھا لطف بیداری
جبینِ شوق ہوتی کوئے جاناں کی زمیں ہوتی

کیوں موجیں اڑاتی ہیں، کیوں شورشِ طوفاں ہے
اللہ غریبوں کی کشتی کا نگہباں ہے

دیوانہ اُسی بُت کا ہر گبر و مسلماں ہے
لغزش ہو فرشتوں کو انساں تو پھر انساں ہے

کیا حسن کا عالم ہے کیا جلوۂ تاباں ہے
آئینہ تو آئینہ وہ آپ بھی حیراں ہے

دنیا میں کوئی کس سے اُمید وفا رکھے
دل جس پہ بھروسہ تھا وہ جان کا خواہاں ہے

دن رات شکایت تھی جس کو مرے نالوں سے
وہ میری خموشی پر انگشت بدنداں ہے

ہاں ہاں جگر و دل میں احساس تو پیدا کر
ہر زخم میں لذت ہے ہر درد میں درماں ہے

ہے طرفہ شفیقی کی آشفتہ مزاجی بھی
گریاں ہے تو گریاں ہے خنداں ہے تو خنداں ہے

سکونِ زندگی حاصل ہوا زنجیر و زنداں سے
چلو فرصت ہوئی دنیا کے افکارِ پریشاں سے

جو دیکھی تھی کسی دن حُسنِ عالم سوزِ جاناں سے
وہ چنگاری ابھی لپٹی ہوئی ہے میرے داماں سے

مقامِ ذی سلم تک تُو جو اے بادِ صبا پہونچے؟
سلام شوق کہہ دینا مرا سلمائے خوباں سے

گر اپنا دستِ وحشت کوئی دم قابو میں آتا ہے
تو صحرا کی ہوائیں شوخیاں کرتی ہیں داماں سے

وہی کرتے رہے صد حیف پامالِ جفا ہر سو ں
وہی دامن بچاتے پھرتے ہیں خاکِ شہیداں سے

وہ رسمِ نامہ و پیغام کے دن اب کہاں لیکن
لپٹ جاتا ہوں اب بھی نامہ دارِ کوئے جاناں سے

ادب سے آنکھیں ملنے کے لئے آتی ہے راتوں کو
سیاہی سنگ اسود کی ترے گیسوئے پیچاں سے

کوئی ایسا نہیں جو اب وفا کو زندگی بخشے
شفیق اس دور میں الفت نہیں انساں کو انساں سے

ہوئے جاتے ہیں سُن سن کہ دلِ ناشاد کے ٹکڑے
تمہاری سخت باتیں ہیں کہ ہیں فولاد کے ٹکڑے

فلک تک جاتے جاتے ہو گئے فریاد کے ٹکڑے
بناتے کیا مرے نالے ستم ایجاد کے ٹکڑے

زمینِ کوئے جاناں کی بہاریں پوچھتے کیا ہو
یہی تختے ہیں گویا گلشنِ شدّاد کے ٹکڑے

ڈرو اللہ سے، ایسا نہ ہو مظلوم کی آہیں
اڑا دیں قلعہ ہائے جبر و استبداد کے ٹکڑے

شفیق اس وادیٔ عشق و جنوں میں تم کہاں آئے
کہیں مجنوں کے پرزے ہیں کہیں فرہاد کے ٹکڑے

گر تم نقاب اُٹھا دو اپنے رُخِ حسیں سے ۔۔۔ لے کروٹیں قیامت ہر گوشۂ زمیں سے
کس کی گذارشیں ہیں کس جلوہ آفریں سے ۔۔۔ آوازِ لن ترانی آتی ہے پھر کہیں سے
اے جبرئیلؑ میری ٹھوکر کا فیض دیکھو ۔۔۔ جاری ہے نہرِ کوثر میخانے کی زمیں سے

اس بُت کی سادگی ہے یا جانِ دلبری ہے ۔۔۔ گویا ٹپک رہی ہے معصومیت جبیں سے
گلشن میں کھیلتی ہے دوشیزگی کسی کی ۔۔۔ دامن سے سب گلوں کے کلیوں کی آستیں سے
حُسنِ ازل نے چاہا چھپنا ہزار لیکن ۔۔۔ ابتک ہے آشکارا معشوق کی جبیں سے
ہو محوِ ناز کوئی مستِ مئے جوانی ۔۔۔ دُنیا مہک رہی ہو گیسوئے عنبریں سے
شب کی حسین دیوی موتی لُٹا رہی ہے ۔۔۔ شبنم کی شوخیاں ہیں اک دُرِّ نازنیں سے

کل جا کے جس گلی میں بدنام ہو چکا ہے
دیکھو شفیق رسوا آتا ہے پھر وہیں سے

حریم ناز کی ہر شے حسیں معلوم ہوتی ہے
یہ تاثیرِ جمالِ ہم نشیں معلوم ہوتی ہے

ذرا آوارگانِ عشق کا ذوقِ طلب دیکھو
کہ ناکامی بھی ناکامی نہیں معلوم ہوتی ہے

سنوارا ہے یہ کس کے حُسن روز افزوں نے نظروں کو
کہ اب ہر چیز دنیا کی حسیں معلوم ہوتی ہے

عیادت کو مریضِ ہجر کی اب تو چلے جاؤ
کہ اب اُمید جینے کی نہیں معلوم ہوتی ہے

ذرا شیخ حرم دیکھے تو بتخانے کی تصویریں
قسم ہے شانِ صورت آفریں معلوم ہوتی ہے

بہار آنے کو آئی ہے مگر کیا بات ہے ساقی
کہ میخانے میں وہ رونق نہیں معلوم ہوتی ہے

وہیں سے ختم ہو جاتی ہے منزل کی تھکن ساری
جہاں سے کوے جاناں کی زمیں معلوم ہوتی ہے

اگر سینے میں دل دے، دل میں دردِ عشق دے یارب
یہ دولت حاصلِ دنیا و دیں معلوم ہوتی ہے

نہ چھیڑ آ آ کے اے مایوسئ غم ان کی حسرت کو
یہ ان سے بھی زیادہ نازنیں معلوم ہوتی ہے

گئے ہیں جب سے وہ تاریک ہے عالم نگاہوں میں
ہمیں اب زندگی اچھی نہیں معلوم ہوتی ہے

وہاں تک اے شفیق آساں نہیں پرواز نظروں کی
جہاں اپنی نگاہِ تنگ بیں معلوم ہوتی ہے

فقم قم یا حبیبی کم تنامی
سناؤں گا غمِ ہجراں نصیبی
گریباں چاک کر ڈالیں گے لاکھوں
معاذ اللہ کسی کی جامہ زیبی
اُسی غارت گرِ ایماں کے آگے
جھکے سب خانقاہی و صلیبی
وہ چلمن سے ہیں مصروفِ نظارہ
زہے میرے جنوں کی دل فریبی
شفیق آئی سکونِ قلب لے کر
مری خاموشیٔ شامِ غریبی

ہیں مٹ کر بھی مزے تقدیر میں مستوں کی محفل کے
بنائے ہیں مرے ساقی نے پیمانے مری گل کے
قیامت خیز ہوں گے اور بھی نالے مرے دل کے
فقط اک آہ نکلی تھی کہ دنیا رہ گئی ہل کے
خیال آزاد ہے جن کا نظر آزاد ہے جن کی
کہیں پابند ہو سکتے ہیں وہ طوق و سلاسل سے
مری تخریب میں گویا مری تعمیر مضمر ہے
کہ پائی ہے حیاتِ جاودانی خاک میں مل کے
جنوں کی خود فراموشی میں بھی شانِ ادب دیکھو
غبارِ قیس سے پردے بنے لیلیٰ کی محمل کے

چلی اب کے برس ایسی ہوا فصلِ بہاری میں
کہ جس سے اور بھی مرجھا گئے غنچے مرے دل کے

یہ کہہ کر رو دئے وہ اپنے دیوانے کی میت پر
ترے ہی دم سے تھے ہنگامے زنجیر و سلاسل کے

فضا تاریک ہے لیکن ہنوز آثار باقی ہیں
چمکتے ہیں ابھی تک جا بجا ذرے مرے دل کے

شفیقی کفر و ایماں کی جو بخشش ختم ہو جاتی
تو کیا دنیا میں ہنگامے نہ ہوتے حق و باطل کے

بدل گیا ہے مذاق زمانہ کیا کہئے / قفس کو جانتے ہیں آشیانہ کیا کہئے

اب اپنے عہدِ وفا کا فسانہ کیا کہئے / کہ تم تو بھول گئے وہ زمانہ کیا کہئے

بہارِ موسمِ گل آئی بھی چلی بھی گئی / نصیب ہی میں نہ تھا آشیانہ کیا کہئے

قدم قدم پہ وہ اپنی نیازمندیٔ عشق / وہ حُسن کی روش کافرانہ کیا کہئے

نہ وہ سنیں نہ زمانے کو اس سے دلچسپی / دلِ غریب کا پُرغم فسانہ کیا کہئے

نگاہِ شوق ہے اور انتظارِ جلوۂ دوست / گذر گیا ہے کتنا زمانہ کیا کہئے

قفس کی رات، اسیری کی نیند، یادِ چمن / زباں پہ تذکرۂ آشیانہ کیا کہئے

مجھے مٹا کے یہ انجامِ حُسنِ یار ہوا / نہ آئینہ ہے نہ زلفوں میں شانہ کیا کہئے

نہ اب چمن میں چمن کی بہار باقی ہے	نہ آشیانہ رہا، آشیانہ کیا کیئے
شفیق حزن کی تصویر ہیں در و دیوار
وہ ہو گئے ہیں جو گھر سے روانہ کیا کیئے

نہیں تیرے سوا کوئی پیامی	الیہ یا صبا بلغ سلامی
وہ سو جائیں تو معراج منامی	وہ جاگیں تو خدا سے ہم کلامی
ہے شاہوں کو بھی وجہ نیک نامی	شہ خوباں تیرے در کی غلامی
تصوّر سے مٹی قسمت کی خامی	رُءیتک یا حبیبی فی منامی
اسی سروِ خراماں کا ہے صدقہ	نسیم صبح تیری خوش خرامی
غضب ہے ان کا اظہار محبت	لعنوانِ وفا، شیریں کلامی
ترس آ ہی گیا ساقی کو آخر	مبارک مجکو میری تشنہ کامی
کرے گی میری تہذیبِ نظر بھی	نقابِ یار کی قائم مقامی
ہر اک زخمی ہے اک ترکِ عجم کا	عراقی ہو کہ رومی ہو کہ شامی
بسر ہوتی ہے کس راحت سے اپنی	ترانم ہے مرادِ شاد کامی
نگارِ سیر گاہِ لی مع اللہ	تعالے اللہ تری عالی مقامی
فسبحان الذی اسرے بعبدہ	الی العرش من البیت الحرامی
الٰہی نزع میں ہو لب پہ جاری	حسینؑ سیدی سندی امامی

شفیق اندازِ حسرت کے علاوہ
ترے اشعار میں ہے رنگِ جامی

نہ پوری ہوگی مرے بعد پھر کمی میری
کہیں گے آپ کہ سونی ہوئی گلی میری

وہ لغزشوں میں بھی اک شان آگہی میری
لُبھا گئی مرے ساقی کو بیخودی میری

نثار پیرِ خرابات کی نوازش کے
کہ اک نگاہ میں دنیا سنور گئی میری

نہیں درست ہے سجدہ بزعمِ ہوش جہاں
اب اس مقام پہ پہونچی ہے بندگی میری

رہِ طلب میں تجلّی کی وہ فراوانی
قدم قدم پہ نظر کھو کے رہ گئی میری

جہاں کو رازِ انا الحق سے باخبر کردوں
جو ناگوار نہ ہو آپ کو خودی میری

جو میں نہیں تو کہاں کائنات کی رونق
چمن میں بو ہے ستاروں میں روشنی میری

تجھے چمن میں تصرف کا حق نہیں گلچیں
کہ پھول پھول ہے میرا کلی کلی میری

سُن اے مجھے نگہہ کم سے دیکھنے والے
کہ میری خود شکنی بھی ہے خودگری میری

مرے قدم نے چمن کو بہار بخشی ہے
اور آج پھول اُڑانے لگے ہنسی میری

کسی کا نام سُنا اور نکل پڑے آنسو
شفیق دردِ مجسم ہے زندگی میری

خود پلاتا ہے کوئی توبہ شکن جام مجھے — نظر آتا ہے نہ اب کفر نہ اسلام مجھے

غم بھی اک شے ہے اگر یاس کا پہلو نہ رہے — پھر تو ہر رنج میں راحت کا ہے پیغام مجھے

اب خوش آتی نہیں یہ کہیں گی شمس و قمر — چاہئے کوئی نئی صبح نئی شام مجھے

ہم نفس شکوۂ رفتارِ زمانہ تا کے — پھیر دیتا ہے رخِ گردشِ ایام مجھے

جس کی فیہ دل میں تڑپتے تھے گلستاں والے — آج وہ خود نظر آتا ہے تہِ دام مجھے

مئے پرستی کے وہ اسرار بتائے ہیں نے — مفتیِ میکدہ کہتے ہیں مئے آشام مجھے

اب تو اس منزلِ پُر کیف میں لایا ہے جنوں — کہ جہاں دیتی ہے ہر شے ترا پیغام مجھے

عشق نے دونوں طرف آگ لگا دی ہے شفیق
چین اُس پردہ نشیں کو ہے نہ آرام مجھے

جہاں گلچیں ہو نے صیاد برق و باغباں کوئی
بنا لو ہمصفیرو مل کے ایسا گلستاں کوئی

سرودِ بلبل و گل کا نہیں ہے قدرداں کوئی
سنا اے وقت کے شاعر پیامِ جاوداں کوئی

بس اب اے ذوقِ عشق آباد کر ایسا جہاں کوئی
جہاں ناقوس بجتا ہو نہ دیتا ہو اذاں کوئی

تنازع للبقا اک کشمکش ہے خود عناصر کی
زمانے کے تصادم سے نہ ہو دامن کشاں کوئی

کہاں تک صرصر و طوفان و برق و باد کے خطرے
بنائے بجلیوں ہی کو چراغ آشیاں کوئی

ترانہ اپنا، بزم اپنی ہے شمع انجمن اپنی
مگر لب بند ہیں کھلنے نہیں دیتا زباں کوئی

چمن محدود ہے معمار کی نازک پسندی سے
بنا لیتا تھا کانٹوں سے ہی سقف آشیاں کوئی

یہ مانا خوب ہے اپنی جگہ جنّت کا افسانہ
سُنا اے ہم نفس تو اس سے بہتر داستاں کوئی

پیامِ صبحِ نو وہ زندگی کی لہر دوڑا دے
فنا کی گود میں بھی لے سکے انگڑائیاں کوئی

جُھلس جائیں گی دیواریں اسی سے قصرِ بدعت کی
ذرا دیکھا کرے جلتے نشیمن کا دُھواں کوئی

لپٹ جائیں گے شعلے دامنِ صیاد و گلچیں سے
جو ہمت ہو تو آ جائے قریب آشیاں کوئی

نگہبانانِ زنداں سے کہو ہشیار ہو جائیں
کرے گا ساری قیدیں توڑ کے آزادیاں کوئی

یہ دورِ آمریت جلد رخصت ہونے والا ہے
بدل دے گا نئے دستور سے نظمِ جہاں کوئی

خدا کا عرش ہلتا ہے، فرشتے کانپ اُٹھتے ہیں
سُنے راتوں کو فریادِ شفیقِ ناتواں کوئی

بہار اگلی سی کیوں گلشن میں اے مالی نہیں آتی
ارے ظالم تجھے پھولوں کی رکھوالی نہیں آتی
چٹک غنچوں کی، شاخوں کی لچک اب بھی گلشن میں
مگر پھولوں سے وہ بوئے خوش اقبالی نہیں آتی
وطن شاداب ہو جاتا ہے جس کی آبیاری سے
اُسی گھر میں بہارِ فارغ البالی نہیں آتی
بڑے حشر آفریں نکلے خرامِ ناز کے فتنے
سُنا کرتے تھے اُن کو طرزِ پامالی نہیں آتی
گلستاں زادیوں کی خستہ حالی اے معاذ اللہ
چمن میں ہیں مگر چہروں پہ ہریالی نہیں آتی
خدا ہی ان حسینانِ وطن کو سرخروئی دے
کہ اب جن کے لب و رخسار پر لالی نہیں آتی
شفیق اہلِ چمن خوش ہوں تو ہوں فصلِ بہاری سے
انھیں غم ہے کہ اب دربار میں ڈالی نہیں آتی

کفر و ایماں کا تصور اگلے افسانے میں ہے ۔۔۔ خانقاہوں کی بھی گنتی اب تو بتخانے میں ہے

آن قدح بشکست و آن پیمانہ و ساقی نماند ۔۔۔ اب شرابِ مغربی مشرق کے پیمانے میں ہے

طبع کی افسردگی، جی کی اداسی ہائے ہائے ۔۔۔ دل بھری محفل میں ہے یا جیسے ویرانے میں ہے

کیا مئے تسنیم میں رکھا ہے اے شیخ حرم ۔۔۔ پی نہیں تو نے جو ان آنکھوں کے پیمانے میں ہے

دیکھ زاہد دانے دانے پر کلیسا کی ہے مہر ۔۔۔ تو ابھی الجھا ہوا تسبیح کے دانے میں ہے

آپ کو اپنے تغافل پر نہ پچھتانا پڑے ۔۔۔ ہائے بیتابی کا وہ عالم جو دیوانے میں ہے

پوچھنا ہے سرمد و منصور سے ہم کو شفیق
لطف پینے میں ہے یا پیکر سے کٹ جانے میں ہے

اپنا مذاق سب سے جدا گانہ چاہیے ۔۔۔ جو وقت کو پلٹ دے وہ افسانہ چاہیے

رہبر کے اعتماد پہ چلنے کا لطف کیا ۔۔۔ خود راہ رو میں ہمتِ مردانہ چاہیے

کافی نہیں ہے آج فقط ذوقِ رہبری ۔۔۔ اب رہ گری کا ذوق حریفانہ چاہیے

وہ جبہہ سائیوں کا زمانہ نہیں رہا ۔۔۔ مزدور کا مزاج بھی شاہانہ چاہیے

کثرت ہے مئے فروشوں کی دن ہو کہ رات ہو ۔۔۔ ساقی کھلا رہے درِ میخانہ چاہیے

پہلے بشر کو چاہیے اپنی جبیں کی قدر ۔۔۔ پھر احترام کعبہ و بتخانہ چاہیے

خود میں ہوں شفیق اور مرے دل کی روشنی
محفل کو میری شمع نہ پروانہ چاہیے

جب تک اپنے ہی پر و بال پہ تھا ناز مجھے
دنگ تھی دیکھ کے جبریل کی پرواز مجھے

ہائے کیوں بھول گئی وہ نگہِ ناز مجھے
کر چکی ہے جو شہیدوں میں سرافراز مجھے

تیرا ادراکِ حقیقت تو بھلا کیا ہوگا
خود بنا دے گا مرا ذوقِ طلب راز مجھے

مجھ سیہ کار کے سجدوں پہ حرم جھوم اُٹھے
وہ بلائیں تو سرِ بارگہِ ناز مجھے

ہے تغیّر سببِ تازگیٔ شام و سحر
چاہیئے روز نئے دور کا آغاز مجھے

آئینہ ٹوٹ بھی سکتا ہے تو اے آئینہ گر
پہلے تو کیوں نہ بنا آئینہ پرداز مجھے

یا یہ دنیا ترے نغمات کے قابل نہ رہی
یا سنائی نہیں دیتی تری آواز مجھے

عشق میں سود و زیاں کا نہیں ہوتا احساس
نظر آتا ہے نہ انجام نہ آغاز مجھے

اللہ اللہ مری خاک نشینی کا عروج
خود شناسی ترے پندار پہ ہے ناز مجھے

میں خزاں میں بھی اُگا لوں گا زمیں سے پودے
میری فطرت نے بنایا ہے چمن ساز مجھے

نہ ملے گا کوئی جب مجھ سا وفادار شفیق
ڈھونڈھتی ہوگی نگاہِ بتِ طناز مجھے

نہ بیاباں کی ہے تخصیص نہ گلزار کی ہے
جلوہ سازی نگہِ دیدۂ بیدار کی ہے
میں تو کہتا ہوں کہ تصویر کا بیجاں ہونا
تنگیٔ ذوقِ نظر چشم خریدار کی ہے
رسن و دار سے منصور نے عزّت پائی
تیرے جانباز سے عزّت رسن و دار کی ہے
ہاتھ میں تیغ ہے، کاندھے پہ کفن، لب پہ رجز
یہی پہچان مرے قافلہ سالار کی ہے
وہ گرمی چھوٹ کے تلوار کفِ اعدا سے
آمد آمد مرے لشکر کے علمدار کی ہے
شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی
راہِ اُلفت میں ضرورت بڑے ایثار کی ہے

میں تو خوش ہوں کہ وہاں پرسشِ عصیاں ہے شفیق
اس بہانے سے رسائی تو گنہ گار کی ہے

زہے قسمت کہ ان کا نقشِ پا زیرِ جبیں آئے
حرم سجدے میں جو جھکتا ہوا عرشِ بریں آئے

اشاروں پہ چلے ابرِ بہاری، بوندیاں برسیں
جہاں ساغر ٹپک دے رند میخانہ وہیں آئے

پپیہے کی صدائیں، آہ یہ کوئل کی آوازیں
چمن میں آ گئی برسات پیارے تم نہیں آئے

سوالِ دید کیسا آپ پردے اُٹھتے جاتے ہیں
خود آئینوں کو خواہش ہے کوئی [illegible]

کیا دعویٰ تو ظرفِ بادہ نوشی تو ہزاروں نے
ہمیشہ انتخابِ چشمِ ساقی میں ہمیں آئے

ترے مظلوم کی آنکھوں سے [illegible]
اگر سوئے فلک دیکھے تو جنبش میں زمیں آئے

ضرورت ہے کہ پھر بیدار ہو ذوقِ حُدی خوانی
ذرا پھر نجد کی جانب کوئی محمل نشیں آئے

وقارِ دلق پوشی، سادگی کی شان، دلِ روشن
خوشا وقتیکہ پھر اپنا وہ عہدِ اولیں آئے

کہاں تک دہر میں دیر و حرم کا اختلاف آخر
اٹھا دو رُخ سے پردہ تم جو بحثِ کفر و دیں آئے

نگاہیں منتظر ہیں صبحِ نو کے اُن مناظر کی
ابھی سورج کی آبادی سے جو باہر نہیں آئے

شفق سے دور، تاروں سے اُدھر، اُس پار کا جلوہ
شعاعوں کے سہارے میری دنیا سے قریب آئے

بہ حسرت دیکھتا ہوں اپنے آثارِ قدیمہ کو
پلٹ کر پھر نہ یارب ان مکانوں کے مکیں آئے

سفینہ وہ کہ جو موجوں کے سینے چیرتا جائے
ڈبو دو ایسی کشتی کو جو ساحل کے قریب آئے

غریبوں پر شفیق اب تنگ ہے جینا دعا مانگو
کہ پھر دنیا میں کوئی رحمۃ للعالمیں آئے

دل عام ملامت کا سزاوار نہیں ہے — تیرا ہے زمانے کا گنہ کا نہیں ہے
آزادیٔ جذبات نے دنیا ہی بدل دی — اب کوئی گرفتار گرفتار نہیں ہے

پامالیٔ عشاق نے یہ دن بھی دکھایا
یوسفؑ ہو مگر کوئی خریدار نہیں ہے

کس درجہ نوازا ہے تری شانِ کرم نے
گویا کہ خطاوار خطا وار نہیں ہے

اے عیسیٔ دوراں یہ تغافل نہیں اچھا
گویا کہ شفیق آپ کا بیمار نہیں ہے

پھر کیوں کہا کہ درد تو پیدا کرے کوئی
اب آئے، درمند کو اچھا کرے کوئی

خود داریٔ نگاہ کو رسوا کرے کوئی
پھر بھی نہ پاسِ چشمِ تمنا کرے کوئی

اللہ رے خود پرستی و خود بینیٔ شباب
آئینہ سامنے ہو تو سجدہ کرے کوئی

جیسے تباہ تو نے کیا در بدر مجھے
ظالم اسی طرح تجھے رسوا کرے کوئی

رُخ سے نقاب اٹھی مگر اللہ رے رعبِ حُسن
کس کی مجال ہے کہ نظارا کرے کوئی

پستی کی تہہ میں بھی ہیں ہزاروں بلندیاں
کیوں جستجوئے اوج ثریا کرے کوئی

دشوار ہو رہی ہے غریبوں کی زندگی
کیوں اُٹھ کے انقلاب پیدا کرے کوئی

پہلا سا میکدہ ہے نہ اگلا سا میفروش
کیا آرزوئے ساغر و مینا کرے کوئی

اب تو حقوق مانگتے پھرتے ہیں کور چشم
اب انتخاب اہلِ نظر کیا کرے کوئی

ماحول ہے خلاف تو کیا عدل کی پکار
انصاف کی فضا بھی تو پیدا کرے کوئی

جس کی وفا سے حُسن کو شہرت ہوئی نصیب
یارب اسی شفیق کا شکوا کرے کوئی